فکر و نظر............ اسلام آباد　　جلد: ۴۷　　شمارہ: ۳

تسمیۂ 'غیر'
(یورپی اور مسلم زبانوں میں مسلمانوں اور اہلِ مغرب کے نام)

تحریر: ڈاکٹر محمد خالد مسعود ☆　ترجمہ: عمر فاروق☆☆

Abstract

Names of things illustrate the multilevel process of classification, on the basis of which various sciences have emerged. While naming the other is an attempt to identify the other and place him on one's cultural map to facilitate dealing with him it is a function of language that adheres to cultural aspect which keeps changing with the passage of time. Nonetheless it is always marked with prejudices however minute they may be. In this context it has taken Western European languages several centuries to call a Muslim a Muslim. It is quite peculiar that in these languages Muslims were called by different names, which were probably neutral in their origins but most came to reflect hostility and contempt. An analysis of these names offers a good example for studying the process of naming the 'other'. This paper looks at these different names and tries to seek possible explanations for this naming process. For comparative purposes, the paper also includes a discussion of how Muslims named the others. Based on this analysis a general outline of the naming process is developed.

This paper relies essentially on an analysis of the usage found in English, French, Spanish, Arabic, Persian and Urdu dictionaries for names for others in each of these languages. The translator has added up some notes of his own wherever he felt necessary.

☆☆☆☆☆

☆ ڈاکٹر خالد مسعود اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان کے موجودہ چیئرمین ہیں۔ وہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں شعبہ فقہ سے متعلق رہے۔ نیز وہ فیکلٹی آف آرٹس، لیڈن یونیورسٹی، ہالینڈ سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔

☆☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

[یہ مضمون 'ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد' اور 'Centre for Muslim-Christian Understanding، جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی' کے باہمی تعاون سے منعقد ہونے والے سیمینار کے منتخب مقالات پر مشتمل کتاب: "Muslims and the West: Encounter and Dialogue"، (شائع شدہ 2001ء)، سے ڈاکٹر خالد مسعود کے مقالے بعنوان: "Naming the 'Other': Names for Muslims and Europeans in European and Muslim Languages" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے اسلوب میں درج ذیل معروضات پیشِ نظر رہیں:

1: ترجمے کا اسلوب اصل کے مطابق رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

2: چند ایک مقامات پر سیاق کی رعایت سے کچھ توضیحی الفاظ یا کسی جملے کا بڑی قوسین [ ] کے اندر اضافہ کیا گیا ہے۔

3: مترجم کی طرف سے نشان زد کرتے ہوئے بعض مقامات پر کچھ حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

4: 'Other' کا ترجمہ موضوع کی مناسبت سے 'دوسرے' کی بجائے 'غیر' زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ مترجم]

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کو 'Muslims' کہنے میں اہلِ مغرب کو کئی صدیاں لگیں۔ چنانچہ یہ ایک منفرد بات ہے کہ مغربی زبانوں میں مسلمانوں کو [مختلف ادوار میں] مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ یہ مختلف نام اپنی اصل کے اعتبار سے [اگر مثبت نہیں تو لازمی طور پر اپنے اندر منفی پہلو بھی نہیں رکھتے، اور ایک طرح سے] غیر جانبداری کے حامل رہے ہوں گے۔ مگر استعمال کے لحاظ سے ان میں سے بیش تر نام نفرت اور دشمنی کے معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان ناموں کے تجزیے سے دوسرے یعنی 'غیر' کو نام دینے کے عمل کی ایک 'نمونہ جاتی توضیح' پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ مضمون ان مختلف ناموں کے تجزیہ و تحلیل سے نام رکھنے کے اس عمل کو ممکنہ طور پر واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔ تقابل کے لیے اس میں یہ بات بھی زیرِ بحث لائی گئی ہے کہ مسلمان اپنے 'غیر' کو کس طرح نام دیا کرتے تھے۔ یوں نام دیے جانے کے عمل کا ایک عمومی خاکہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ہمارا بنیادی انحصار انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، عربی، فارسی اور اردو زبان کی معروف لغات میں درج 'غیر' کو دیے گئے ناموں کے معانی و استعمال پر رہا، اور اس ضمن میں دی گئی لسانی و تاریخی معلومات کو یہاں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مطالعہ مکمل اور جامع نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم، ہمارے علم کی حد تک، بہت کم مطالعوں میں اس نقطۂ نظر سے نام رکھنے کے عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہمارے اس مطالعے کا مقصد نام دینے کے عمل کی سماجی اور مذہبی جہات کو روشن کرنا ہے۔ اس تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ 'غیر' کو دیے گئے نام عام طور پر مستقل حیثیت کے حامل نہیں ہوتے، بلکہ وہ مختلف ثقافتی اثرات کے باعث ان اقدار [جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں] کی

اہمیت میں کمی بیشی [یا ان کے ردّ و قبول] کے سبب بدلتے رہتے ہیں۔

ا۔ تسمیہ (نام رکھنے) کا عمل

دوسرے یا 'غیر' کو دیے گئے مختلف ناموں کے تجزیے سے قبل خود نام رکھنے کے عمل کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تسمیہ کا یہ عمل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے سماجی، ثقافتی، تاریخی اور مذہبی عوامل اس عمل کے دوران اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیے گئے نام میں کسی خاص ثقافتی وحدت کی سماجی اور مذہبی اقدار کو مجسم و مرموز کرنے میں زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ نام یا علائم، ثقافتی اقدار کے ایک پورے مجموعے کی عکاسی کرتے ہیں، جو کسی قوم کے 'تصورِ کائنات'، طبقاتی تقسیم اور مذہبی اعتقادات کی نمائندگی کرتا ہے۔ نام اس خطے کو بھی نشان زد کرتے ہیں جو دنیا کے 'ثقافتی نقشے' پر کسی خاص ثقافتی وحدت کا علم بردار ہو۔ تاہم، یہ 'ثقافتی نقشہ'، اس خاص ثقافت کی پروردہ اقدار کو دوسری ثقافتی وحدتوں کے مقابل، موضوعی لحاظ سے ایک معروضی روپ (subjective objectification) دیتا ہے۔

نام دینے کا عمل ذاتی، گروہی اور دیگر مختلف سطحوں پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہاں کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم ذاتی ناموں، اسمائے اشیا اور خاص طور پر تسمیۂ 'غیر' سے تعرض کریں گے۔

ذاتی نام

ناموں میں پہلی حیثیت ذاتی نام کو حاصل ہے، جو عمومی لحاظ سے شناخت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ نام ایک کو دوسرے شخص سے ممیّز کرتا ہے۔ البتہ، بیش تر ثقافتوں میں ذاتی نام انفرادی پہچان کی علامت سے بڑھ کر نسلی، معاشرتی اور مذہبی شناخت کے وسیلے کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ مختلف ثقافتوں میں نام رکھنے کی تقریبات کے تفصیلی رسم و رواج اس بات کا عملی اظہار ہیں کہ ذاتی نام کسی خاص 'ثقافتی وحدت کے جہانِ اسما' میں شخص کی اجتماعی شناخت کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ اس پر ہم ذرا بعد میں بات کریں گے۔ فی الوقت، ذاتی نام کے ایک اور پہلو کا قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔

ذاتی نام بہت سی ثقافتوں میں حاملِ اسم کی شخصیت اور اس کے مستقبل سے وابستہ خیال کیے جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ایک مسلمان مضمون نگار کے درج ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں، جو اس بات کے غماز ہیں کہ نام بعض مسلمانوں کے نزدیک اپنے حامل کے کردار کی نمائندگی بھی کرتا ہے:

''نام کے معانی شخص کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نام کا صوتی آہنگ، اس

میں پائے جانے والے حروفِ علت، سب حروف کی باہم موافقت، ان کی تعداد، نوعیت [اور ان سے حاصل ہونے والا عدد(۱)]، نیز وہ مادہ یا بنیادی حروف جن سے نام اشتقاق پذیر ہوا، اور [بلحاظِ ترتیب و اجتماع] ان حروف سے پیدا شدہ اثر [اور برآمد ہونے والے معانی(۲)]؛ یہ سب چیزیں ایک ماہر پیشین گو پر نام [اور اس نام کے حامل شخص] کے اسرار منکشف کرتی ہیں۔ نام کے معانی اس کے حامل، نیز دیگر لوگوں پر بھی گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ نام کے حروف اور ان سے متشکل لفظ کے صوتی آہنگ سے کوئی صوفی [یا جوگی/ بھکشو] ایک شخص کے کردار اور مقسوم کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔''(۳)

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نام ساحرانہ عناصر کا حامل وتشکیل دہ ہوتا ہے، اور یہ کہ ذاتی نام ایک مقدس راز ہے۔ بعض معاشروں میں کسی شخص کو اس کے نام سے پکارنا ناشائستہ خیال کیا جاتا ہے۔ [پاکستان سمیت] جنوب ایشیائی ممالک میں قریباً دونسلیں پہلے تک بیوی اپنے خاوند کا نام زبان پر نہیں لاتی تھی۔(۴) بعض مذہبی روایات میں [برے] نام سے پکارنا اور خدا کے ناموں سے قسم اٹھانا کفر قرار دیا گیا ہے۔ ذاتی نام کو ایک پُر اثر جادوئی لفظ سمجھا جاتا ہے، جسے جان کر کوئی شخص معینہ نام کے حامل پر قابو پا لیتا ہے۔ بعض صوفیہ اس اعتبار سے 'ذکر' کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں۔ [یعنی اس طرح آدمی خدائی طاقتوں پر گرفت حاصل کر لیتا ہے]۔ اس پسِ منظر میں 'ذکر' سے عام طور پر خدا کے ناموں (اسمائے حسنیٰ) کا ورد کرنا مراد لی جاتی ہے(۵)، (۶) خدا کو [اور پھر اس تقلید میں پیغمبرِ اسلامؐ کو بھی] ایک خاص تعداد میں، یعنی ننانوے نام دیے گئے ہیں۔ جب کہ کہا جاتا ہے کہ خدا کا اصل نام یا 'اسمِ اعظم' خود خدا ہی کو معلوم ہے۔ کچھ صوفیہ، البتہ، یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ انھیں 'اسمِ اعظم' کا علم ہے۔(۷)

بعض معاشروں میں بچوں کے نام مخالفین کے دل میں خوف بٹھانے اور اپنی شجاعت و بسالت کے اظہار کے لیے شکاری جانوروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں، جیسے [شیر کے یہ مختلف نام]: لیونارڈ، لیون، اسد، شیر، سنگھ، [غضنفر، ضیغم، حیدر، ارسلان یا ازلان]۔ (۸) اسلامی ادبیات میں مناسب اور نامناسب ناموں کے سلسلے میں خاصی بحث پائی جاتی ہے۔ پیغمبرِاسلامؐ کے بہت سے اقوال سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے بعض لوگوں سے اپنے نام تبدیل کرنے کو کہا، اور ایسے کئی نام بدل دیے جو 'وحدتِ خداوندی' کے تصور سے متصادم تھے یا اچھے معانی کے حامل نہ تھے۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک شخص کا نام ' اَصرم' (بمعنی معذور) سے بدل کر 'زُرعة' (باصلاحیت) رکھ دیا؛ ایک دوسرے شخص کا

نام 'حرب' (جنگ) سے تبدیل کر کے 'سلام' (امن) رکھا؛ اور ایک تیسرے نامناسب نام 'حَزْن' (بمعنی ناہموار) کو بدل کر 'سهل' (یعنی ہموار) نام رکھا۔(۹) اسی طرح آپ خوشی (یا خوش قسمتی) کے معنوں پر دلالت کرنے والے نام رکھنے کا مشورہ نہ دیتے۔ مثال کے طور پر آپ نے 'اَفلح' (بمعنی کامیاب)، 'رَباح' (نفع)، ' یَسار' (خوش حالی) اور 'نافع' (نفع بخش) کے الفاظ کو بطور نام اختیار کرنے سے منع کیا۔(۱۰) اس کی توجیہ یہ کی گئی کہ ایسے ناموں کا مفہوم بعض موقعوں پر منفی ہو جاتا ہے، جیسے 'یسار' نام کے کسی شخص کو پکارا جائے اور وہ موجود نہ ہو، تو جواب آئے گا: ''یسار (خوش حالی) یہاں نہیں ہے۔ یوں اچھے اور خوش کن معنوں کا حامل نام، اس جملے میں بدشگونی کا مفہوم دے گا۔ اس توجیہ سے نام رکھنے کے عمل کے دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں: خوش حالی اور فائدہ مندی ایسی معاشرتی ثقافتی اقدار، اور بعض بیانات کا برا اثر۔

انٹرنیٹ پر ایک مسلمان صاحبِ علم کے ذیل کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان اب بھی ناموں کے سلسلے میں ان کے معانی کو اہمیت دیتے ہیں:

> ''بچے کا خوبصورت اور باوقار نام رکھنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبرِاسلامؐ نے ہمیشہ اچھے اور خوبصورت معنی کے حامل ناموں کا انتخاب کیا، اور لوگوں کو ایسے نام رکھنے پر ٹوکا جو مناسب مفہوم پر دلالت نہ کرتے ہوں۔ اسی طرح کچھ نام اس وجہ سے تبدیل کیے کہ وہ برے سماجی اثرات کے حامل تھے۔''(۱۱)

جب کہ کچھ دیگر مسلم محققین نام تبدیل کیے جانے کے اس عمل کی مذہبی لحاظ سے توجیہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیغمبر نے صرف وہ نام تبدیل کیے جو ماقبلِ اسلام (زمانۂ جاہلیت(۱۲) کے مذہبی اعتقادات کی عکاسی کرتے تھے۔ اس دور کے ناموں کے برعکس، جو فلاں دیوتا (اِلٰہ) یا دیوی (اِلٰهة) کے 'عبد' (غلام) ہونے کے معنوں پر دلالت کرتے تھے(۱۳)، تبدیل شدہ ناموں میں 'وحدتِ خداوندی' کے تصور پر زور دیا گیا۔ نئے نام، 'عبد' کے لفظ کو خدا کے مختلف ناموں سے اضافت دے کر تشکیل دیے گئے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اگرچہ عربی نام کو ترجیح دی جاتی تھی، لیکن اسے لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم بعد میں کچھ علما نے عربی نام پر اصرار کیا، اور نومسلموں کے خاص طور پر عربی نام رکھے گئے۔ یوں شدہ شدہ یہ بات ایک عام عقیدے کی شکل اختیار کر گئی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد نومسلم کے لیے نام تبدیل کرنا ضروری ہے، اور نیا نام لازمی طور پر عربی ہونا چاہیے۔ تاہم سارے علما اس رائے کے حامل نہ تھے۔

اس موضوع پر بحث و دلائل کا سلسلہ تا حال جاری ہے، جو اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ انٹرنیٹ پر ہی ایک مضمون نگار اے محمد نے عربی نام پر اصرار کو خواہ مخواہ کی اپج (یعنی بدعت) قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> ''یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا ہے تو عقیدہ و ایمان کے نام نہاد محافظ لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور اسے مسلمان (یعنی تابعِ فرمان) بنانے کے لیے مضحکہ خیز تقاضوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔
> سوال یہ ہے کہ آیا یہ نام واقعی 'اسلامی' ہیں یا محض عربی [الفاظ پر مشتمل] اسما ہیں؟ مزید برآں، کیا 'اسلامی نام' ایسی کسی شے کا وجود پایا جاتا ہے؟(۱۴) علاوہ ازیں، اسلام اگر ایک آفاقی دین ہے، جو ثقافت و تمدن اور رنگ ونسل سے بے نیاز ہے، تو کسی کو مسلمان بنانے کے لیے نام کی تبدیلی پر اصرار کرنا، اسے کہیں اسلام کی آفاقیت کے تصور سے تو متنفر نہ کر دے گا، [اور یوں وہ اسلام قبول کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے]؟!''(۱۵)

نام کی تبدیلی پر توجہ دینا خاص طور پر ان معاشروں میں ضروری قرار دیا گیا جہاں پر مسلمانوں نے اپنے علیحدہ سماجی اور ثقافتی تشخص کو نمایا کرنا چاہا۔ یہ بات اس وقت اہمیت اختیار کر گئی جب اصلاحی تحریکوں نے اسلام سے ایک اجتماعی نوعیت کا تعلق استوار کرنے پر زور دینا شروع کیا۔ ان مسلمانوں کو جو مکمل طور پر دوسروں سے الگ نہ ہو گئے، نام کے مسلمان کہا گیا۔ اس قسم کی بحثوں کے ذریعے پہچان کی علامت کے طور پر ذاتی ناموں کی معاشرتی اور مذہبی اہمیت اور نمایاں ہو کر سامنے آئی۔

اشیا کے نام

نام دینے سے اشیا کی تقسیم و تبویب عمل میں آتی ہے۔ اگر چیزوں کے نام نہ ہوتے، تو دنیا مادے کا ایک بہت بڑا ناقابلِ شناخت تودہ ہوتی۔ دنیا کی پہچان اور اس میں پائی جانے والی اشیا کا فہم و ادراک تبھی ممکن ہے جب انھیں مختلف حصوں میں بانٹ کر ان کے نام رکھے جائیں۔ اشیا کو نام دینے کا عمل ایک سطح پر انجام نہیں پاتا۔ انھیں باہمی مناسبتوں کے تحت مختلف درجہ بند مجموعوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ماقبلِ جدید دور میں چیزوں کو درجہ وار انداز میں جمادات (بے جان وجود)، نباتات (پودوں کا جاندار وجود)، اور حیوانات (غیر عاقل و عاقل وجود) میں تقسیم کیا جاتا

تھا۔ اس سے نام دینے کا وہ عمل واضح ہوتا ہے جس کے تحت اشیا کے مجموعوں کو آپس میں مشترک اقدار، نیز ممیّز کرنے والی خاصیتوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس مثال میں زندگی کو تقسیم کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ ایک دوسری تقسیم میں چیزوں کو ان کی ساخت اور سالموں کی کثافت کے لحاظ سے ٹھوس، مائع اور گیس میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اشیا کا علم انھی تقسیموں پر مبنی ہے۔ مختلف سائنسی علوم، جیسے نباتیات، حیوانیات، کیمیا، وغیرہ اسی تقسیم و تبویب کے تحت ظہور میں آئے، اور انھیں تقسیموں سے چیزوں کے سائنسی نام اخذ کیے گئے۔(۱۶) اشیا کے عام مستعمل نام، ان کے سائنسی ناموں سے مختلف ہو سکتے ہیں، اور بعض اوقات ان کے معانی بھی واضح نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن، چیزوں کے نام [اور ان کی خاصیتوں] کے علم سے ایک طرح سے ان پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے، [نیز اس سے جاننے والے کی 'علمیت' اور برتری کا بھی اظہار ہوتا ہے]۔

قرآن میں آدم [جو انسان کا نمائندہ نام بھی ہے] کی دیگر مخلوقات و قویٰ پر برتری کو ایک تمثیل کے ذریعے بیان کیا گیا ہے،(۱۷) جس سے آدم [یعنی انسان] کی یہ صلاحیت واضح ہوتی ہے کہ وہ اشیا کو نام دے سکتا ہے، [اور یوں انھیں ان کے خواص کے تحت اپنی گرفت میں لا سکتا ہے]۔

اس بات پر اہلِ علم میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا کسی چیز کو دیا گیا نام بامعنی اور اس میں پائی جانے والی خصوصیات کا نمائندہ بھی ہوتا ہے؟ تاہم ، یہ بات سب کے ہاں مسلّم ہے کہ نام شے کے لیے ایک علامت اور پہچان کا کام دیتا ہے۔ عربی میں نام کو 'اسم' کہا جاتا ہے، جو لُغوی اعتبار سے (س م و) اور (و س م) ہر دو ترتیب کے بنیادی حروف یا مادوں سے ماخوذ ہے۔ پہلا مادہ بلندی، شہرت اور برتری کے معنی دیتا ہے، جب کہ دوسرا علامت یا نشان کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح (اسم) کا لفظ دونوں طرح کے معانی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔(۱۸)

اب تک ہماری گفتگو کا دائرہ نام رکھنے کے عمل تک محدود رہا، جس کا اصل مقصد نام دادہ شے یا شخص کی پہچان ہے۔ مضمون کے آئندہ حصے میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ تسمیہ کے عمل کا یہ بنیادی مقصد کیونکر بدل جاتا ہے۔

تسمیۂ 'غیر'

دوسرے کو نام دینا یقیناً ایک پیچیدہ عمل ہے۔ دوسرا یا 'غیر'، جو عام طور پر اجنبی ہوتا ہے، بسا اوقات ایک در انداز یا دشمن شمار کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے 'غیر' کو نام دینا بنیادی طور پر اسے پہچاننے کی کوشش کرنا ہے، تاکہ اسے اپنے 'ثقافتی، تہذیبی نقشے' پر مناسب جگہ دی جا سکے۔ جب کہ یہ

نقشہ کوئی جغرافیائی نقشہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسا متصوّر مقام ہوتا ہے جسے کوئی معاشرہ اپنے 'تصورِ کائنات' کے تحت متعین کرتا ہے۔ 'غیر' کو اس نقشے میں جگہ دینا، اس کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ اس عمل میں دہرے مقصد کی جھلک نظر آتی ہے؛ یعنی ایک طرف اگر 'غیر' کو اس کی بعض نمایاں خصوصیات کی بنیاد پر الگ کرنے میں سہولت رہتی ہے، تو دوسری جانب انھی خصوصیات کی عدم موجودگی کے باعث خود کو ممیّز کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اس دہرے عمل کا سمجھنا زیادہ آسان ہو گا۔

تسمیۂ 'غیر' سلسلے کی ایک دلچسپ مثال، جس سے اس 'تہذیبی، ثقافتی نقشے' کا کردار بخوبی واضح ہوتا ہے، ممالک کے نام ہیں۔ ایک ایرانی لغت نویس بہار کی رائے میں ممالک کے نام زیادہ تر اس پہلے ثقافتی رابطے کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں جس میں ایک قوم دوسری سے آشنا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رومی لوگ پہلے پہل یونان کے گریشیاس (Gracias) نامی ایک قبیلے سے ملے، اور اس بنا پر ان کے ملک کو گریس (Greece) کا نام دیا۔ جب کہ فارس کے باشندوں کا پہلا رابطہ آیونا (Iona) نام کے قبیلے سے ہوا۔ اس طرح ان کے ہاں یہ ملک 'یونان' کہلایا۔(۱۹)

اقوام کے تسمیہ میں بھی عام طور پر یہی چیز کارفرما نظر آتی ہے۔ ہم یہاں اپنے متعین کردہ عنوان کی رعایت سے مسلمانوں اور اہلِ مغرب کے ایک دوسرے کو دیے گئے ناموں کا جائزہ لیں گے۔ مغرب میں مسلمانوں کو جو نام دیے گئے وہ یہ ہیں: اگارین (Agarines)، عرب (Arab)، ہیگارین (Hagarines)، محمڈن (Mohammaedens)، مُور (Moors)، مسلم/ موزلم (Moslems)، مسلمان (Mussulmans)، سیراسن (Saracens)، اور ترک (Turks)۔ مقابل میں، مسلمانوں نے مغربی اقوام کے لیے ذیل کے نام استعمال کیے: افرنگ، (فرنگ، فرنگی)، انگریز، گورا، مغربی (Westerner)، ولایتی، ولندیزی، یورپی اور یونانی۔

ان مختلف ناموں کے حوالے سے تسمیۂ 'غیر' کے عمل کو جاننے کے لیے ہم یہاں لغت نویسوں کے تاریخی استقرا اور تجزیے سے بصیرت حاصل کریں گے۔

۲۔ مسلمانوں کے نام

ہیگارن (Hagaren)

آکسفورڈ کی لغت میں Hagaren کو مسلمانوں کا قدیم ترین نام کہا گیا ہے، جو مغرب میں استعمال ہوا۔ لغت میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ نام پیغمبر ابراہیمؑ کی بیوی 'ہاجر' کی طرف نسبت

ہے۔ چونکہ مغرب کا مسلمانوں سے پہلا رابطہ حجاز سے تعلق رکھنے والے عربوں سے ہوا، جو ابراہیمؑ کی 'ہاجر' سے پیدا ہونے والی نسل سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا عرب اور پھر بعد کے غیر عرب مسلمان بھی اسی نام سے پکارے گئے۔(۲۰) اب اس نام کا استعمال تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ صرف کچھ عرصہ پہلے (1977ء میں) Patricia اور Michael Cook نے اسلام کے بارے میں اپنی کتاب کا نام (Hagarism) رکھا تھا۔(۲۱) البتہ ساتویں صدی عیسوی کے مصادر میں عربوں کے لیے اشماعیلی (Ishmaelites) کا نام دیکھنے میں آتا ہے۔(۲۲) یعنی مسلمانوں کو 'ہاجر' کی بجائے 'ہاجر' سے ابراہیمؑ کے بیٹے اسماعیلؑ سے نسبت دی گئی، تاکہ [لفظی تقابل سے] عربوں اور اسرائیلیوں (Israelites) کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ اسرائیلی ابراہیمؑ کے اپنی دوسری بیوی 'سارہ'(۲۳) سے پیدا ہونے والے بیٹے اسحاقؑ کی نسل سے تھے [جن کے فرزند یعقوبؑ کو اسرائیل (Israel) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے]۔ Coverdale (1535ء) نے، البتہ، ذیل کے جملے میں Ishmaelites کو [بظاہر] Hagarens سے الگ شمار کیا ہے:

> "The tabernacles of the Edomites and Ismaelites, the Moabites and Hagrens..."(۲۴)

> (''ایدومیوں اور اسماعیلیوں، موآبیوں اور Hagrens کے خیمے...''۔)

[تاہم، اسے ہم ایک طرح کا 'لف و نشرِ مرتب' کہہ سکتے ہیں، جس کے تحت Moabites اور Hagrens کے الفاظ اگلی ترکیب میں Edomites اور Ismaelites کی توسیع کے لیے لائے گئے ہوں]۔

لاطینی زبانوں میں Hagarens کا یہی لفظ Agarin بن گیا۔

ساریسن (Saracens)

Hagaren یا Agarin کا لفظ جلد ہی Saracen سے تبدیل ہو گیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران اس نام کا استعمال نہایت عام تھا۔ بلکہ بیسویں صدی تک مسلمانوں کا یہ نام استعمال ہوتا رہا۔ سید امیر علی کی 'A Short History of Saracens'، جو دمشق، بغداد اور قرطبہ کے مسلمانوں کے درخشاں عہد کا احاطہ کرتی ہے، کوئی زیادہ عرصہ قبل نہیں لکھی گئی۔(۲۵) Saracen کا لفظ قدیم انگریزی میں لاطینی لفظ Saraceni سے ماخوذ ہے، جسے قدیم فرانسیسی اور جرمن زبان میں Sarazin لکھا جاتا تھا۔ جب کہ اطالوی زبان میں اسے Sacacino اور ہسپانوی میں

Saracenο لکھتے تھے۔(۲۶)

Saracen کے لفظ کی اصل اور معانی واضح نہیں۔ لغت کی کتابوں میں اس کی مختلف توضیحات ملتی ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ Saracen غالبًا Sarken کا لاطینی روپ ہے، جو عربی لفظ 'شرقیّین' (اہلِ مشرق) سے ماخوذ ہے۔(۲۷)

ایک وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ Saracen لاطینی لفظ Saracenus سے نکلا ہے، جو دراصل دورِ متأخر کی یونانی زبان میں Sarakēnos تھا، جس کا مطلب ہے خانہ بدوش، صحرا نورد لوگ۔ متأخر دور کی یونانی اور لاطینی زبان میں شام و عرب کے بادیہ نشین لوگوں کو Saracens کہا جاتا تھا۔ پھر یہ نام تمام عربوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا، اور صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں پر عمومی لحاظ سے اس کا اطلاق کیا گیا۔(۲۸)

ایک اور وضاحت یہ ہے کہ Saracens کا مطلب 'سارا' سے ابراہیمؑ کی نسل ہے۔ قبل ازیں مذکور ہوا کہ عربوں اور عمومی طور پر مسلمانوں کو Hagarens بھی کہا جاتا تھا، جو ابراہیمؑ کی پہلی بیوی 'ہاجر' (Hagar) کی طرف نسبت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انھیں 'سارا' سے کیوں نسبت دی گئی؟ آکسفورڈ ڈکشنری اس کی یہ وضاحت کرتی ہے کہ 'ہاجر' چونکہ ایک لونڈی تھی،(۲۹) اس لیے صلیبی حملہ آوروں نے مسلمانوں کو حقارت سے Hagarens یا Agarens کا نام دیا، کہ وہ ابراہیمؑ کی جائز اولاد نہیں۔(۳۰) سینٹ جیروم کے خیال میں مسلمانوں نے خود کو Saracens، یعنی Sarah کی نسل اس لیے کہنا شروع کیا کہ وہ ان طعنوں کو ختم کر سکیں۔(۳۱) مگر 1854ء میں بھی، Milman کے بقول، پاپائے اعظم مسلمانوں (Saracens) کا ذکر Hagarenes ہی کے نام سے کیا کرتا تھا، اور اس کا مطلب 'طیش و زِنا کی اولاد' لیتے تھے۔(۳۲)

شاید یہی پسِ منظر تھا کہ Saracen کا یہ لفظ بھی کسی حد تک منفی معنوں کا حامل رہا۔ عمومی لحاظ سے یہ لفظ غیر متمدن، کافر، مشرک اور ملحد کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔(۳۳) کئی یورپی زبانوں میں یہ لفظ اب بھی کسی نہ کسی سلبی مفہوم میں رائج ہے۔ مثال کے طور پر ہسپانوی زبان میں Saracina لڑائی اور قتلِ عام کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۳۴)

مذکورہ صدر نام یہ واضح کرتے ہیں کہ نام رکھنے کا عمل ایک خاص دائرۂ کار میں رہتے ہوئے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے کو پہلے اپنے 'ثقافتی، تہذیبی نقشے' میں لا کر ایک 'مضافاتی' جگہ، یعنی نام دیا جاتا ہے۔ پھر، جیسے کہ صلیبی جنگوں میں دیکھا گیا، آویزش کے دور میں یہ نام مخاصمانہ اور رنج دہ

اندازِ نظر کے حامل معانی میں استعمال ہونے لگتا ہے، تاکہ ایک طرف 'غیر' کے 'برے کردار' کو نمایاں کیا جا سکے، اور دوسری جانب خود کو اسی 'برے کردار' کی عدم موجودگی سے ترفع بخشا جائے۔(۳۵)

مُور (Moor)

Saracen کے بعد مسلمانوں کو Moor کے نام سے پکارا گیا۔ Saracen کا لفظ اگر ازمنۂ وسطیٰ کے مذہبی ماحول کی عکاسی کرتا ہے، تو Moor کا نام ثقافتی پہلو کو نمایاں کرتا نظر آتا ہے۔ یہ نام اب بھی جنوبی فلپائن، بالخصوص منڈانو کے کچھ حصوں اور جزائر سولو میں آباد مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔(۳۶) Moor کا یہ لفظ مختلف ہجائی شکلوں میں نظر آتا ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے یہ ہجے ملتے ہیں: Mour؛ Moro (وسطی دور کی انگریزی)؛ More (وسطی دور کی فرانسیسی)؛ Moure؛ Mowre؛ Maure؛ اور Moore۔ دیگر زبانوں میں اس کے ہجے یہ کیے گئے: لاطینی میں: Maurus اور Morus؛ یونانی میں: Mauros؛ ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی میں: Moro۔

لاطینی Morus اور یونانی Mauros کے ہجے غالبًا شمالی افریقا کی پرانی زبانوں سے لیے گئے۔(۳۷) کچھ زبان شناسوں کا خیال ہے کہ یہ بنیادی طور پر ایک یونانی لفظ ہے جو سیاہ، ملگجے یا کور (اندھے) کے معنی دیتا ہے۔(۳۸) سیاہ فام، بالخصوص افریقی نسل کے لوگوں پر اس کا اطلاق کیا گیا، اور اسی مفہوم میں اس لفظ نے دیگر زبانوں میں راہ پائی۔ انگریزی زبان میں اس کا استعمال بسا اوقات black کے مترادف کے طور پر کیا جاتا ہے۔ 1489ء کا ایک مصنف Caxton کسی شخص کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> (He was) "so angry for it that he became as black as a Moure".(۳۹)
>
> (وہ ''اس قدر غصے میں تھا کہ [اس کا چہرہ] Moure کی طرح سیاہ ہوگیا''۔)
>
> [گویا Moure سے تشبیہ دینے کے بعد خود Moure کے لفظ نے black کے معنوں میں رواج پایا]۔

ایک دوسری ہجائی صورت Morus، نسل کے معنوں کی جھلک اپنے اندر رکھتی ہے۔ تاریخ کی پرانی کتب میں بحرِ متوسط کے قریب واقع افریقی ممالک کو Mauritania اور Morocco،(۴۰) اور ان کے باشندوں کو Moor کہا گیا ہے۔ یہ توجیہ شاید سابقہ وضاحت سے مختلف نہ ہو۔ عین ممکن ہے

کہ Mauritania اور Morocco کا نام وہاں رہنے والے سیاہ نسل کے باشندوں کی وجہ سے رکھا گیا ہو۔ عربوں کے ہاں بھی مصر کے بعد واقع افریقی ممالک کو 'بلاد السُّودان'، یعنی سیاہ فام لوگوں کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ تاہم، واقعہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں بسنے والے سفید فام لوگ بھی Morus کہلاتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ نسل کے معنوں کا حامل نظر آتا ہے۔ البتہ اس بات کے پیشِ نظر کہ افریقا کے تمام باشندے سیاہ فام نہیں، ان میں white moor اور black moor کے اطلاق سے فرق کیا گیا۔ مؤخر الذکر Negro کا ہم معنی ہے۔(۴۱) لیکن اس فرق کے اعتبار سے بھی یہ نام اپنے اندر 'نسل' کا پہلو سموئے ہوئے ہے۔(۴۲)

انگریزی میں moor کا لفظ بنجر قدیم اور ناکاشتہ زمین کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ انگریزی بولنے والوں کے ہاں یہ لفظ غیر متمدن لوگوں کے لیے فوری ضرورت کے تحت استعمال میں آنے لگا ہو۔ اسی مناسبت سے Moorish اور Moorman کے الفاظ، جو بنیادی طور پر بے آب و گیاہ، بنجر علاقے (Moorland) میں بسنے والوں کے لیے بولے جاتے تھے، بسہولت برِّصغیر کے مسلمانوں کے لیے استعمال ہونے لگے۔(۴۳)

آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو البیریا کے لوگ انھیں اس وجہ سے Mour کے نام سے پکارنے لگے کہ وہ افریقا سے آئے تھے۔ بہت سے مسلمان 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد بھی کئی صدیوں تک اسپین میں مقیم رہے۔ اسپین کی عیسائی ریاست میں اس مسلم رعایا کو Morisca یا Morisco (فرانسیسی میں Moresque) کا نام دیا گیا،(۴۴) اور عیسائی ہو چکنے والے مسلمانوں پر بھی اسی نام کا اطلاق کیا گیا۔(۴۵) ایک اور نام Mudejar، جو انھی معنوں میں استعمال ہوا، غالبًا عربی لفظ 'مدجَّن' کی ہسپانوی شکل ہے، جس کے معنی پیچھے رہ جانے والے کے ہیں۔ [تاہم بعید نہیں کہ 'مدجَّن' کا یہ لفظ بھی، 'دُجنة' بمعنی تاریکی و سیاہی، سے ماخوذ ہونے کی رعایت سے Mour ہی کے معنوں میں بولا جاتا ہو]۔

ہسپانوی زبان میں اس لفظ کے استعمال کی خاصی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں، جن سے ماضی میں مسلمانوں کے بارے میں اہلِ سپین کے محسوسات کا پتا چلتا ہے۔ مثال کے طور پر mora کا مطلب مستبد یا سخت گیر خاوند ہے۔ mora Y cristanos کی ترکیب سے مراد ہے سیاہ پھلی کے ساتھ چاول کا کھانا۔ یعنی چاول، جو سفید ہوتے ہیں، مسیحیت کی نشانی ہوئے، جب کہ سیاہ پھلی مسلمانوں کی علامت قرار پائی۔(۴۶)

پرتگالی پندرھویں صدی عیسوی میں بحرِ ہند پہنچے، اور وہاں کے مسلمانوں کو Moros یا Mouros کے نام سے پکارا۔(۴۷) برطانیہ سمیت دیگر یورپی اقوام نے بھی، جو ان کے بعد یہاں پہنچیں، یہی نام استعمال کیا۔ اس طرح انگریزی زبان میں ہندوستان، بالخصوص گجرات کے ساحلی علاقوں کے مسلمان Moor کہلائے۔ 1697ء میں Dampier نے Moors کو سلطنتِ مغلیہ کی رعایا کہا۔(۴۸) بعد ازاں مذہبی حوالے سے صرف مسلمانوں کو Moor کہا گیا۔(۴۹) 1763ء میں، Scafton کے بقول، انگریز Moor کے لفظ کو سب فرقوں کے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔(۵۰) Hobson- Jobson کے مطابق اس لفظ کے استعمال اور پھر ترک کیے جانے کی آخری شہادت انیسویں صدی کے آغاز کی ملتی ہے، جب بنگال میں اس کا رواج ختم ہو گیا۔(۵۱)

مسلمان (Mussulman)

اس لفظ کی دیگر ہجائی شکلیں یہ ہیں: Musleman؛ Muselman؛ Musulman؛ Musalman؛ Mussilman؛ Musulamanus (وسطی دور کی لاطینی)؛ Musulman (فرانسیسی اور ہسپانوی)؛ (اطالوی میں) Musulmano؛ (جرمن زبان میں) Muselmann؛ اور (فارسی اور اردو میں) مسلمان Musalmān۔ بہت سی یورپی زبانوں میں Musulman کا نام اب بھی Muslim سے زیادہ مستعمل ہے۔ انگریزی میں اس لفظ (Mussulman) کے آخری جز 'man' کو علامتِ تذکیر سمجھا گیا، اور یوں مسلمان عورت کے لیے انگریزوں نے Mussul-woman کا لفظ استعمال کیا۔(۵۲)

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق یورپی زبانوں میں Musalman کا نام فارسی لفظ مسلمان (Musulmān) سے ماخوذ ہے، جو دراصل مسلم (Muslim) کے عربی لفظ کا فارسی روپ ہے۔(۵۳) یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی میں یہ لفظ وسطی دور کی لاطینی سے آیا ہو، یعنی Musulamanus سے ماخوذ، جو غالباً بارھویں صدی کے اراگینی (Aragonese) لفظ Musulmanus سے لیا گیا ہے۔(۵۴)

ابن عبدِ ربّہٖ کی توضیح ہے کہ عرب لوگ اسلام قبول کرنے والے غیر عرب (عجمی) کو 'مُسلِمانی' کہا کرتے تھے، تاکہ اسے عربوں سے الگ کیا جا سکے۔ ابتدا میں یہ لفظ نومسلموں کے لیے اہانت کا مفہوم لیے ہوئے تھا۔ رفتہ رفتہ ذم کا پہلو اس سے محو ہو گیا۔(۵۵)

’لغت نامہ دہخدا‘ کے مطابق ’مسلمان‘ (Musalmān) کا لفظ دراصل ’مسلم مان‘ تھا، جو فارسی میں ’مانندِ مسلم / مسلمان جیسا‘ کے معنی دیتا ہے۔(۵٦) ایک دوسری توضیح یہ ہے کہ ’مسلمان‘ کا لفظ دو فارسی الفاظ (’مُ‘ اور ’سلمان‘) سے مرکب ہے۔ فارسی میں عام طور غیر زبانوں کے الفاظ پر ’مُ‘ کا سابقہ لگا کر ان کی تفریس کی جاتی ہے، جیسے ’ششدر‘ سے ’مُششدر‘۔(۵۷) اپنے خلاف عربوں کے تعصب کا جواب دینے کے لیے ایرانیوں نے (جنھیں عرب لوگ ’مَوالی‘، یعنی آزاد کردہ غلام کہا کرتے تھے) خود کو ’’مُسلمان‘‘ (Mu-Salmān) کہنا شروع کردیا، یعنی سلمان فارسیؓ کے مانند جو پیغمبرؐ کے ایک صحابی تھے۔(۵۸)

دہخدا نے ان توضیحات سے اتفاق نہیں کیا اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ’مسلمان‘ کا لفظ ’مُسُلِم‘ کے عربی لفظ کی فارسی انداز پر جمع ہے، جو [الفاظ کے آخر میں الف نون (ان) کا لاحقہ لگا کر بنائی جاتی ہے۔ کثرتِ استعمال سے اس کا تلفظ ’مُسلْمان‘ سے بدل گیا۔ بعد ازاں، کچھ دیگر جمع کے صیغوں کے مانند، یہ جمع] فردِ واحد کے لیے بھی استعمال ہونے لگی، [جیسے ’جاناں‘ کا لفظ، جو واحد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے]۔ ’مسلمان‘ کی جمع پھر ’مسلماناں‘ کی گئی۔

محمڈن (Mohammadan)

Mohammedan، Mohamadan اور Mahometan کے الفاظ بیسویں صدی کے اواسط تک کافی مقبول رہے۔(۵۹) مذکورہ صدر ناموں کے برعکس، یہ نام مذہبی پہلو کا حامل ہے۔ یہ پیغمبرِ اسلام محمدؐ کی طرف نسبت کی نشان دہی کرتا ہے، اور دیگر مذہبی قوموں کے نام سے مماثلت رکھتا ہے، جو اسی طرح خود کو اپنے پیغمبر یا بانی کے نام سے منسوب کرتی ہیں، جیسے: Christians (عیسائی/مسیحی)، جو Christ (عیسیٰؑ/مسیحؑ) کی طرف نسبت ہے؛ اور Buddhists (بدھ مت کے پیروکار)، جو گوتم بدھ (Buddha) سے منسوب ہیں۔ Mohammadan کے نام سے واضح ہے کہ اس میں حقارت یا ذم کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا۔ سولھویں صدی عیسوی کے انگریزی ادب میں مسلمانوں کے اس نام کے ساتھ سپہ گری (جس سے ان کا جنگجوانہ کردار واضح ہوتا ہے)، صفائی، ایمان اور ثروت ایسے اوصاف منسوب کیے گئے ہیں۔(٦۰) خود مسلمان بھی عام طور پر اپنے لیے ’اُمّتِ محمدی‘ (الأمة المحمّدية) کا نام استعمال کرتے رہے ہیں۔ مغرب کے ’مقبولِ عوام‘ ادب میں ’محمڈن‘ کے نام میں یہ پہلو بھی شامل رہا کہ مسلمان اپنے پیغمبر محمدؐ کی عبادت کرتے ہیں۔ مسلم علما نے اس بات کو رد کیا، نیز یہ بھی واضح کیا کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں، اور پیغمبر محمدؐ [اس لحاظ سے] اس کے

بانی نہیں ہیں [کہ انھوں نے یکسر ایک مختلف دین کی طرح ڈالی ہو۔ بلکہ یہ ابراہیمی مذاہب کے سلسلے کی آخری کڑی ہے]۔

ترک (Turk)

یورپی ادبیات میں ایک لمبے عرصے تک مسلمانوں کو 'تُرک' (Turks) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا۔(۶۱) آغاز میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ بعض اوقات نام پہلے رابطے کی بنیاد پر بھی رکھے جاتے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بعض یورپی اقوام کی مسلمانوں سے شناسائی عثمانی ترکوں کے ذریعے عمل میں آئی۔ یورپی زبانوں میں ترک کے لفظ کے ساتھ منسلک مفاہیم سے عثمانیوں کے یورپ میں دبدبے اور خوف کی عکاسی ہوتی ہے، اور اسی مناسبت سے یہ لفظ عام طور پر مسلمانوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں درج ایک استعمال سے کہ: "Musulman is a Turkish priest."(۶۲) یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، عام بول چال میں Turk کا لفظ کافر و بے دین (Infidel) کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

مسلم (Muslim)

اس لفظ کے دوسرے ہجے یہ ہیں: Moslem اور Mooslim، جن میں اول الذکر زیادہ مستعمل ہے۔(۶۳) اس لفظ سے ماخوذ ذیل کے مختلف صفاتی نام بھی مسلمانوں اور ان کے مذہب کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں: Moslemic، Moslemite، اور Moslemism۔(۶۴) آکسفورڈ ڈکشنری Moslem کے لفظ کی یہ تعریف کرتی ہے: ''وہ جو اسلام قبول کرتا ہے [مسلمان کہلاتا ہے]۔''(۶۵) اسی لغت میں Bedwell کی 1615ء میں بیان کردہ یہ تعریف بھی نقل کی گئی ہے: ''Moslem وہ ہے جو Mohametans کے عقائد کا حامل ہو''۔(۶۶)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ Muslim کا لفظ اگرچہ بطور نام استعمال کیا گیا، تاہم یہ ابھی تک Mohametanism [کی سابقہ اصطلاح اور اس حوالے سے مسلمانوں کے بارے میں قائم کردہ رائے] سے منسلک تھا۔ آخر الامر، Webster کی لغت میں، ثقافتی تعصب سے ہٹ کر Muslim کے نام کی سادہ الفاظ میں یہ تعریف ملتی ہے کہ یہ عربی فعل 'اَسْلَمَ' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں '(خدا کے سامنے) سرِ تسلیم خم کرنا'۔ یوں Muslim کا مطلب اسلام پر کاربند یا ایمان رکھنے والا ہوا۔(۶۷) اسلامی روایت میں یہ نام پہلے پہل پیغمبر ابراہیمؑ نے ایک خدا پر ایمان رکھنے والوں کے لیے استعمال کیا تھا۔(۶۸)

۳۔ مغرب اور اہلِ مغرب کے نام

یہاں ہم مختصراً مسلمانوں کی بعض زبانوں میں اہلِ مغرب کو دیے گئے مختلف ناموں کا جائزہ لیں گے۔ اس جائزے کا اصل مقصد نام رکھنے کے عمل میں زاویۂ نگاہ کے اختلاف کو ظاہر کرنا ہے۔ جامع انداز پر ان ناموں کا تجزیہ یہاں مقصود نہیں۔ اہلِ مغرب کے مختلف ناموں سے پہلے خود 'مغرب' کے نام پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مغرب/ West

مغرب یا West کا لفظ اس جگہ کے لیے بولا جاتا ہے جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ لہٰذا فطری طور پر تاریکی کے معنی اس میں پوشیدہ ہیں۔ یورپی اور سامی زبانوں میں West اور مغرب کے الفاظ دوری اور فاصلے کے معنوں پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ [اسکاٹ لینڈ کے بالائی حصوں اور آئرلینڈ کے باشندوں کی زبان] Gael میں West کا مطلب 'پرے، دور اور عقب یا واپس' لیا جاتا ہے۔ 'Going West' سے مراد ہے 'غائب ہو جانا یا چھپ جانا'۔(۶۹) عربی زبان میں (غَرُب یا مَغْرِب) کا لفظ west کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ (غَرَبَ) کا مطلب ہے 'دور ہونا'۔ (غَرَّبَ) کے معنی ['دور کرنا، جلا وطن کرنا اور] گھر سے دور ہونا' کے ہیں۔ [تاہم 'شَرَّقَ' کے مقابل یہ لفظ 'مغربی سمت میں سفر کرنا' کے معنی بھی دیتا ہے]۔ افعال کے ساتھ ساتھ اسما میں بھی یہی فاصلے اور دوری کے معنی پائے جاتے ہیں۔ (غُربة) کا لفظ 'پردیس' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (غریب) سے مراد ہے 'گھر سے دور شخص، کوئی اجنبی، دشمن یا مخالف'۔ یہ لفظ کسی نامانوس شے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔(۷۰) (غُرَاب) کا لفظ، جو عربی میں کوّے کے لیے بولا جاتا ہے، دوری اور تاریکی کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔(۷۱، ۷۲)

West کا لفظ اپنے استعمال کے لحاظ سے کسی معینہ جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ مغربی سمت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ West کے نام سے شناخت کیے جانے والے مختلف مقامات، بات کرنے والے کے ذہنی پسِ منظر اور اس کی گفتگو کے سیاق و سباق سے واضح ہوتے ہیں۔ وسطی دور کی انگریزی میں West سے مراد سطحِ مرتفع والے علاقے لیے جاتے ہیں۔ بعد میں یہ لفظ امریکا کے لیے استعمال ہونے لگا۔(۷۳) جب کہ امریکی استعمال میں اس کا مطلب مغربی سمت میں واقع ریاستیں ہیں۔ western کا لفظ، ان ریاستوں میں آباد لوگوں کے دشوار طرزِ زیست کی نمائندگی کرتا

ہے۔ یہ ریاستیں زیادہ تر صحرائی علاقے پر مشتمل ہیں۔ اس لیے western کے لفظ میں دشت کی وحشت میں زندگی گزارنے کا پہلو شامل ہے۔ Westernism کی اصطلاح، جو پہلے پہل 1884ء میں نبراسکا میں استعمال کی گئی، اسی وحشت زدہ دشوار طرزِ زندگی کے لیے اختراع کی گئی۔(۷۴)

West اور Western کے لفظ کا ثقافتی اور تہذیبی مفہوم میں استعمال کوئی زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ اس استعمال کے مطابق Western سے مراد یونانی اور رومی روایت کے زیرِ سایہ پنپنے والی یا اس سے متبادر مغربی (Occidental) تہذیب و ثقافت ہے جو اسلامی، ہندوستانی یا مشرقِ بعید کے (Oriental) تہذیبی نظام سے مختلف ہے۔ اس سے پہلے اس لفظ کا استعمال صرف سمت کے لیے تھا۔ 1395ء میں رومی سلطنت کی East اور West میں تقسیم کے ساتھ West کا نام زیادہ تر یورپ کے مغربی حصوں کے لیے استعمال کیا گیا۔(۷۵) شاید اس لیے کہ انھیں سلطنتِ عثمانیہ سے ممیّز کیا جا سکے۔

بیسویں صدی کے وسط میں کمیونزم کے یورپ میں باقاعدہ آغاز کے بعد کمیونسٹ ممالک کو East کے نام سے غیر کمیونسٹ 'ویسٹرن بلاک' (بشمول امریکا) سے ممتاز کیا گیا۔(۷۶)

عربی زبان میں 'مغرب' کے لفظ کا اطلاق (شمال مغربی) افریقی ممالک پر کیا گیا، [جنھیں '**بلاد المغرب**' کا نام دے کر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: دور کے ممالک کو '**المغرب الاَقصیٰ**'، اور وسطی و قریبی ممالک کو بالترتیب: '**المغرب الاَوسط**' اور '**المغرب الاَدنیٰ**' کہا گیا]۔ خاص '**المغرب**' (al-Maghrib) نام کا ملک اب مراکش (Morocco) کہلاتا ہے۔(۷۷) جب کہ یورپ کے لیے 'مغرب' کے لفظ کا استعمال غالبًا موجودہ دور میں کیا گیا، [ورنہ زیادہ تر 'غَرْب' کا لفظ ہی یورپ اور امریکا کے لیے استعمال ہوا، اور اب بھی استعمال میں بیش تر یہی لفظ رواج پذیر ہے]۔ آکسفورڈ کی انگریزی عربی لغت (1980ء) میں West کو '**بلاد المغرب**' لکھا گیا ہے، اور اس سے یورپ اور امریکا مراد ہیں۔ جب کہ 'مغربی تہذیب' کو ['غرب' کے لفظ سے نسبت دے کر] '**الحضارة الغربية**' کہا جاتا ہے۔(۷۸)

افرنج / فرنگ

اہلِ یورپ کے لیے عام طور پر '**اَفرنج یا اِفرنج**' کا لفظ عربی زبان میں موجودہ دور تک استعمال میں رہا۔(۷۹) **المُنجِد** کی لغت میں 'اَروام' (مشرقی یورپ کے لوگ) اور 'اَتراک' (ایشیائے کوچک کی ترک قوم) کے استثنا سے، باقی اہلِ یورپ کو 'افرنج' کہا گیا ہے۔(۸۰) اس نام کا استعمال یورپ کے

تمام باشندوں کے لیے صلیبی جنگوں کے بعد شروع ہوا۔(۸۱)

’افرنج‘ کا لفظ، دراصل، Frank یا Franques کی تعریب ہے، جو ایک قبیلے کا نام ہے، جس سے مسلمانوں کا پہلے پہل سامنا ہوا۔ مؤرخ مسعودی نے ان کا ذکر ’جنگجو ترین قوم‘ کے لقب سے کیا ہے۔(۸۲) مشرقی زبانوں میں ’افرنج‘ کے لفظ کی دیگر صورتیں یہ ہیں: (فارسی میں) فرنگ؛ (اردو میں) فرنگی؛ (تبّتی زبان میں) پیلونگ (Pelong)؛ (چینی زبان میں) فُلانگ (Fulang)؛ اور (تاملی میں) پرنگی۔ جب کہ سنگھالی زبان میں ’پرنگی‘ سے صرف پرتگالی مراد ہیں۔(۸۳) اردو ادب میں فرنگی کا لفظ، مکّار کا بھی مترادف ہے۔

ولایتی

’فرنگی‘ کے علاوہ ہندی اور اردو میں یورپی باشندوں کو دیگر نام بھی دیے گئے۔ ’ولایتی‘ کا لفظ عربی لفظ ’ولی [یا والی]‘ سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے کسی جاگیر یا خود مختار علاقے کا مالک یا حاکم۔ ’ولایت‘ کسی اقلیم، صوبے، حکومت اور آباد ریاست کو کہتے ہیں۔ برِصغیر میں یہ لفظ عام طور پر اس غیر ملک کے لیے استعمال کیا گیا جس نے یہاں آ کر حکومت کی۔ پہلے اس کا اطلاق فارس، وسط ایشیا یا افغانستان پر کیا جاتا تھا۔ بعدازاں یہ لفظ انھی معنوں میں یورپ اور خاص طور پر انگلستان کے لیے استعمال کیا گیا۔(۸۴) جب کہ ایک دوسرا لفظ انگریز (جو پرتگالی لفظ Anglēs سے ماخوذ ہے)، [عام طور پر انگریزی بولنے والے] تمام یورپی باشندوں کے لیے استعمال ہوا۔ مقامی لہجوں میں ’ولایت‘ کا تلفظ ’بِلایت‘ (Bilayut) اور ’بِلّیت‘ (Billait) بھی کیا گیا۔(۸۵)

اسی طرح یورپ سے درآمد کی جانے والی مختلف اشیا پر ’ولایتی‘ کا اطلاق کیا گیا، جیسے: ولایتی بینگن (ٹماٹر)، ولایتی پانی (سوڈا واٹر)، وغیرہ۔(۸۶)

گورا

عام بول چال میں اہلِ یورپ کو ’گورا‘ بھی کہا گیا۔ لفظی اعتبار سے اس کا مطلب ’سفید فام شخص‘ (whiteman) ہے۔ تاہم استعمال کے لحاظ سے اس میں دلچسپ سیاسی اور سماجی پہلو نظر آتے ہیں۔ ’گورا شاہی‘ کا مطلب ’مضبوط جوتے‘ ہیں۔ مگر اس سے مطلق العنان حکومت مراد لی جاتی ہے۔(۸۷) یعنی بوٹ، جو فوجی بوٹ ہیں، طاقت اور اقتدار کی علامت قرار پائے۔ ’گورا‘ کا یہ لفظ برِصغیر میں ایک ذات (caste) کے لیے بھی استعمال ہوا۔(۸۸) نیز ’گورا‘ عام طور پر یورپی فوجی، عام سپاہی، یا ہر اس یورپی شخص کے لیے بولا گیا جو ’صاحب‘، ’معزز آدمی‘(۸۹) یا طبقۂ شرفا(۹۰) کے

زمرے میں نہ آتا ہو۔(۹۱)

۴۔ مشرق میں تسمیۂ 'غیر' کا عمل

اب تک اہلِ مغرب اور مسلمانوں کی مختلف زبانوں میں ایک دوسرے کی شناخت کے لیے رکھے گئے ناموں اور ان کے اطلاق کے بارے میں بات کی گئی۔ یہاں ہم قدرے اختصار سے عربی، فارسی اور اردو/ہندی میں تسمیۂ 'غیر' کے عمل کا جائزہ لیں گے۔

عربوں کے ہاں 'غیر'

عرب لوگ اپنی زبان پر بے حد فخر کیا کرتے تھے۔ وہ دوسروں کو اپنے مقابلے میں 'عجم' کا نام دیتے، جس کے معنی 'بے زبان اور گونگے' کے ہیں۔(۹۲) غیر عرب علاقوں کو '**بلاد العجم**' کہا جاتا تھا، جس سے عام طور پر فارس کے علاقے مراد تھے۔ (**عُجمة**) کے لفظ کا اطلاق بولنے میں لکنت یا ادائیگیِ الفاظ میں ناہمواری اور زبان کی نادرستی و عدم فصاحت پر کیا گیا، جو گنوار پن کے مترادف تھا۔ (**أعجم**) گونگے، غیر عرب، مخالف و دشمن، اور اس اعتبار سے فارس سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے بولا گیا۔(۹۳) اندلس میں عرب لوگ، ہسپانوی زبان کو (**العَجَمية**) کہتے تھے۔(۹۴) نیز عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہسپانوی کو aljamiado کا نام دیا جاتا تھا۔(۹۵، ۹۶)

اہلِ فارس کے نزدیک 'غیر'

اہلِ فارس، عربوں کو 'تازی' کا نام دیتے تھے۔ لغات میں اس نام کی درج ذیل توضیحات ملتی ہیں:

۱۔ تاز، عرب نسل کے جدِ امجد سیامک (بن میشی بن کیومرث) کے بیٹے کا نام تھا، جس سے انھیں نسبت دی گئی، جب کہ فارس کے باشندے (عجم) ہوشنگ کی نسل سے تھے۔(۹۷)

۲۔ 'تازی' کا لفظ فارسی مصدر ''تاختن'' سے ہے، جس کے معنی غارت گری اور حملہ کرنے کے ہیں۔ عربوں کو 'تازی' اس لیے کہا گیا کہ وہ غارت گرانہ کارروائیوں کے لیے مشہور تھے۔(۹۸)

۳۔ 'تازی'، 'تاژ' یا 'تاز' کے لفظ سے ہے، جس کا مطلب خیمہ یا چادر/ترپال ہے۔ 'دہقان' کے مقابل عربوں کو اس لیے 'تازی' کہا گیا کہ وہ [خیموں میں رہنے والے] صحرا نشین لوگ تھے۔(۹۹)

۴۔ عرب ایرانیوں کے توسط سے چین میں متعارف ہوئے، اس لیے اہلِ چین بھی عربوں کو 'تاش' کا

نام دیتے تھے، جو دوبارہ فارسی میں 'تازی' سے بدل گیا۔(۱۰۰)

۵۔ لغت نویس بہار کے خیال میں قدیم ایرانی، 'اجنبی یا دوسرے' کو 'تاژیک' یا 'تاچیک' کے نام سے پکارتے تھے، جیسے یونانی اپنے 'غیر' کو 'بربر' اور عرب لوگ اپنے مقابل کو 'عجم' کا نام دیتے تھے۔(۱۰۱) [یہی 'تاژیک' بعد میں 'تازی' تلفظ کیا جانے لگا۔ جب کہ وسط ایشیا میں 'تاچیک' کا نام برقرار رہا، جو ترکی زبان میں 'تاجیک' ہو گیا، اور فارسی بولنے والوں پر اس کا اطلاق کیا جانے لگا]۔(۱۰۲)

۶۔ 'تازی'، دراصل، 'طائی' کے لفظ کی مفرّس شکل ہے۔ ایرانی عربوں سے 'طی' نام کے ایک بدوی قبیلے کے ذریعے متعارف ہوئے۔ چنانچہ وہ باقی عربوں کو بھی 'طائی یا تائی'، اور بعد میں 'تازی' کے نام سے پکارنے لگے۔(۱۰۳، ۱۰۴)

اہلِ ہند کی نظر میں 'غیر'

[سندھ میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد، اور پھر اس علاقے میں عربوں کی مختلف ریاستی حکومتوں کے بعد برِّصغیر پر باقاعدہ حملے اور حکومت کی غرض سے] مسلمان گیارھویں صدی عیسوی میں ماوراء النہر (وسط ایشیا) کے راستے ہندوستان وارد ہوئے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کو یہاں 'ترک' کہا گیا۔ ہندی میں 'ترک' کا مطلب مسلمان فوج کا سپاہی لیا جاتا تھا، جب کہ ضمنی معنوں میں اس سے مراد تھی 'وحشی، سلب نہب کرنے والا یا آوارہ سیلانی'۔ اپنے بیش تر مرکبات میں یہ لفظ ترکوں کے فوجی کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔ 'ترکتازی' کا مطلب ہے 'تیز اور فوری حملہ'۔ 'ترک مزاج' سے 'گنوار اور وحشی طبیعت [یا ایسی طبیعت کا مالک شخص]' مراد لی جاتی ہے۔ 'ترکی بہ ترکی' کا مطلب ہے 'ایسے کو تیسا' یا 'اکھڑ پن کا اسی طرح اکھڑ پن سے جواب دینا'۔ 'ترکی تمام ہونا' سے مراد ہے 'وہ اعزاز جو ختم ہو جائے'۔(۱۰۵)

ہندی اردو ادب میں لفظ 'ترک' کا استعمال محبت و نفرت کے امتزاج کا حامل ہے۔ شاعری میں عام طور پر [فارسی کے زیرِ اثر] 'ترک' سے خوبرو یا تند مزاج متکبر شخص مراد لی جاتی ہے۔ 'ترک چشم' کا مطلب ہے 'جادو اثر آنکھیں [یا ایسی آنکھوں والا شخص]'۔(۱۰۶) لوک گیتوں میں 'ترکوا' (Turakwa) سے اکثر 'مسلمان عاشق' کا مفہوم لیا جاتا ہے۔(۱۰۷، ۱۰۸)

اختتامیہ

انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، عربی، فارسی اور اردو میں مسلمانوں اور اہلِ مغرب کو دیے گئے ناموں کے اس مختصر جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ تسمیہ کا یہ عمل ایک لسانی عمل ہے جو 'دوسرے' یا

’غیر‘ کو کسی قوم کے ’ثقافتی، تہذیبی نقشے‘ میں اس کے لیے طے کی گئی جگہ کے حوالے سے شناخت کرتا ہے۔ یہ عمل پہلے ’غیر‘ کو اس نقشے میں ایک معروف ترین مقام پر لا تا ہے، پھر اس پر اپنے ثقافتی تعصّبات کی چھوٹ ڈال کر دیے گئے نام کو باہم ایک علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ تاہم، نام کا یہ ثقافتی پہلو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں اور مغرب کے بارے میں لغت میں درج تعریفات حقائق سے قریب تر اور ثقافتی تعصّبات سے کسی حد تک آزاد ہو کر قلم بند کی گئی ہیں۔ لیکن یہ ثقافتی تعصّبات پھر بھی کسی نہ کسی صورت ان لفظوں کے استعمال میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

نئے ناموں کے سلسلے میں ایک اور تغیر سامنے آیا ہے، جو عربی زبان کے حوالے سے ہے۔ ’جدیدیت‘ پر بحث و مکالمے کے ضمن میں اسلامی ثقافت کی تعریف متعین کرنے کے لیے عربی زبان کو پہلے سے زیادہ استناد و اعتبار حاصل ہوا ہے۔ ما قبلِ جدید زمانوں میں اسلام کے بارے میں مغرب کے ’ثقافتی نقشہ جات‘ بڑی حد تک مختلف مسلم اقوام کے ساتھ براہِ راست میل جول کے ذریعے ترتیب دیے گئے تھے۔ مسلم دنیا میں بھی اسلامی تہذیب و علوم کے بہت سے مراکز تھے، جو اپنی اپنی زبانوں میں کام انجام دے رہے تھے۔ لیکن موجودہ دور میں جب کہ مذہب پر بحث و تحقیق کے سلسلے میں اصل شے کو بنیادی اعتباری حیثیت حاصل ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی زبان ہونے کے ناتے عربی زبان پھر سے اپنی اہمیت حاصل کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں عربی نام رکھنے اور ان کا درست عربی تلفظ ادا کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔(۱۰۹) علاوہ ازیں، خلیج اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مقیم افریقی اور ایشیائی تارکینِ وطن جب اپنے ممالک کو لوٹتے ہیں تو اپنے کاروبار، گھروں اور گلیوں کے عربی نام رکھتے ہیں، جو اسی مذکورہ رجحان کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تاہم، مذہب کی بازیافتگی اور صحیح اسلام کو سمجھنے کی طلب بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یورپ میں عام رواج ہے کہ وہاں کے نومسلم اپنا ایک اضافی عربی نام بھی رکھتے ہیں، اور اس کے ساتھ Moslem یا Mozlem کی بجائے خالص عربی لہجے میں خود کو ’مسلم یا مسلمہ‘ کہہ کر اپنا تعارف پیش کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ حاشیہ از مترجم: نام کا عدد نکالنے اور اس عدد کی خاصیت بتانے کو 'علم الاعداد' کا نام دیا جاتا ہے، جسے 'حساب **الجُمَّل**' (ابجد، ہوز، حطی... الخ) کے تحت حروف کے لیے مقرر کردہ اعداد سے تشکیل دیا گیا ہے۔ شاعری میں حروف کے انھی اعداد کے تحت 'مادۂ تاریخ'، یعنی مصرعوں کے الفاظ سے کسی واقعے، تقریب وغیرہ کی تاریخ نکالی جاتی ہے، جسے 'تاریخ گوئی' کہتے ہیں۔ ناموں کے سلسلے میں بھی اسی طریقے سے عدد نکالا جاتا ہے، جو اکائیوں میں ہوتا ہے، اور پھر ہر عدد کی 'جوتش' کے حوالے سے مقرر کی گئی خاصیت کی بنا پر کوئی نام رکھا جاتا ہے یا اس نام کے حامل کی شخصیت کے بارے میں معلوم کیا جاتا ہے، جو ظاہر بات ہے کہ حروف (اور نجوم) کی خاصیتوں (اور اثرات) پر یقین رکھنے والے محدود ذہنی افق کے حامل، ضعیف الاعتقاد لوگوں سے ان کی قوتِ ارادی اور جذبۂ عمل سلب کرنے کی ارادی یا نادانستہ کوشش، نیز عملی زندگی میں منافقت اور نری چالاکی سے کام لینے والوں کی تقویت کا بھی باعث ہے۔

۲۔ حاشیہ از مترجم: عربی میں کسی لفظ کے بنیادی حروف یا مادے (root) میں ان حروف کی ترتیب اور اجتماع سے مخصوص معانی برآمد ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات زیرِ بحث موضوع سے دور جا پڑتی ہے، تاہم Occult Sciences اور زبان کے علوم میں فرق جاننے کے لیے اس سلسلے میں دو ایک باتیں عرض کرنا بے جا نہ ہو گا۔ زبان کے علوم میں '**فقه اللغة**' یا Phylology کے موضوع پر قدیم یا قدیم انداز پر تالیف کردہ کتب میں مادوں اور ان میں ترتیب و اجتماعِ حروف سے متعلق تفصیلی مباحث ملتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی کی (**المُزهِر فی اللغة**) عمومی لحاظ سے، جب کہ صدیق حسن خان قنوجی کی ایک مستقل کتاب (**العَلَم الخفّاق فی علم الاشتقاق**) خاص اس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر ''**المبین**'' کے عنوان سے سلیمان اشرف بہاری کی ایک تصنیف ملتی ہے (جو اصل میں لبنانی ادیب و تاریخ نگار جرجی زیدان کی '**فلسفة اللغة العربية**' کے جواب میں لکھی گئی)۔ '**فقه اللغة**' کے مقابل '**علم اللغة**' یا عام لسانیات (Linguistics) کے بانی فردی ناند دی سوسیئر (Ferdinand de Saussure) نے زبان کے تاریخی و ارتقائی مطالعے (Diachronic Study)، ہر زبان کی اپنی منفرد خصوصیات اور الفاظ کے اشتقاقی جائزے کی بجائے مختلف زبانوں کے مشترک عمومی خصائص اور لمحۂ موجود میں ان کے مطالعے (Synchronic Study) پر توجہ دی، نیز اپنے نظریۂ زبان میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ بنیادی طور پر الفاظ کا ان کے معنی و مدلول یا کسی مناسبت کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اندھا دھند (arbitrarily) اشیاء پر اطلاق کیا گیا ہے۔

۳۔ http://www.blackmind.com/MVSG/NAMES.HTM

۴۔ حاشیہ از مترجم: عربوں میں 'کنیت' کا چلن، اور عام طور پر اسی سے پکارنے کا رواج تھا۔ اب بھی ان کے ہاں عام طور پر کنیت سے کسی کو بلانا مہذب سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ حاشیہ از مترجم: خدا کے نام یا (اسمائے حسنیٰ) قرآن میں وارد ہونے والے خدا تعالیٰ کے مختلف صفاتی نام ہیں، جو (عام طور پر آیات کے آخر میں) محض سجع کی رعایت سے نہیں، بلکہ حقیقت میں اس ظاہری صوتی تاثیر کو ساتھ لیے سیاق کی مناسبت سے وارد ہوئے ہیں۔ مفہوم کی رعایت سے ان ناموں کے استعمال کے بارے میں

غلام احمد پرویز کی کتاب ''من و یزداں'' میں تفصیلی بحث ملتی ہے۔ فلسفے کے حوالے سے 'اسمائے حسنیٰ' کی توجیہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کے ریسرچ اسکالر جناب قیصر شہزاد کے ایم اے کے تھیسس کا موضوع رہا ہے۔

۶۔ حاشیہ از مترجم: (ذکر) کے لغوی معنی یاد کرنا کے ہیں۔ دہرانا اور تکرار کرنا اس میں شامل نہیں۔ البتہ، صوفیانہ اصطلاح میں اس سے کسی وظیفے کا دہرانا اور ورد کرنا مراد لیتے ہیں۔ ورنہ قرآن کی اصطلاح میں (ذکر) کا مطلب خدا کے قوانین اور اس لحاظ سے خدا کو یاد رکھنا ہے۔ اس اعتبار سے (اهل الذکر) کا مطلب 'یاد رکھنے والے' ہوگا، 'وظیفہ/ورد کرنے والے' اس سے مراد نہیں لیا جا سکتا۔ ﴿**فاسئلوا أَهل الذكر إن كنتم لا تعلمون**﴾ [النحل: 43، الأنبياء: 7] کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ ''اگر تم نہیں جانتے (یا بھول گئے ہو) تو ان سے دریافت کر لو جو (عمومی لحاظ سے یا متعلقہ شعبے کی باتوں کو یاد رکھتے، یعنی) علم رکھتے ہیں''۔ یہی بھولنے اور یاد رکھنے کا مضمون عام انسانی اور شعری حوالے سے بھی سامنے آتا ہے۔ (محبت اور نفرت اور تلخی اور شیرینی :: کسی نے کس طرح کا پھول مارا یاد رہتا ہے / تمھارا ظرف ہے تم کو محبت بھول جاتی ہے :: ہمیں تو جس نے ہنس کر بھی پکارا، یاد رہتا ہے .... عدیم ہاشمی)۔ یہاں لازمی طور پر دہرانا اور تکرار کرنا پیشِ نظر نہیں۔ انسانی زندگی میں 'باتوں کو دہرانے' کا مطلب، انھیں تازہ و بامعنی انداز میں سامنے لانا ہے، نہ کہ فرسودہ و پامال شے (cliche/ stereotype) بنا ڈالنا۔ کسی بات، شعر، مقولے یا حوالے کی خاطر کسی متن کو چند ایک بار دہرا لیا جاتا ہے، یا وقتاً فوقتاً نظر ڈال لی جاتی ہے، ورنہ دریافت کر لیا جاتا ہے۔ بے وجہ کسی بات کی بہ تسلسل تکرار کیے چلے جانا تحصیلِ حاصل و کارِ دارد ہے، اور بیش تر صورتوں میں نفسیاتی خلل کی علامت بھی۔

۷۔ حاشیہ از مترجم: (اسمِ اعظم) کی اصطلاح اور اس سے منسلک تصور دراصل یہودی فقہ کی کتاب (تلمود) سے ماخوذ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پیغمبر سلیمانؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے نگینے پر (اسمِ اعظم) منقوش یا کندہ تھا۔ اسی وجہ سے جن و انس، چرند، پرند، درند اور دیگر مخلوقات جنابِ سلیمانؑ کی مطیع تھیں۔ اس خاتمِ سلیمانی کے کھو جانے اور دوبارہ حاصل ہونے کا ایک قصہ بھی دیومالائی نوعیت کی مذہبی تاریخی روایات میں مذکور ہے، جو قرآن کی تفسیری کتب میں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ مسلم صوفیہ نے (اسمِ اعظم) کا یہ تصور لے کر خدا کے ناموں (اسمائے حسنیٰ) میں اس خاص نام کو تلاش کرنا چاہا۔ مشہور صوفی محی الدین ابنِ عربی کے بقول: ''خدا کے سب نام عظیم ہیں، 'اسمِ اعظم' کونسا ہے؟''........ (یہاں ضمناً یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا کہ باطنی روحانیاتی نظام کی اصل یہودی روایات میں ملتی ہے، اور قطب، ابدال کے سلسلے بھی وہیں سے اخذ کیے گئے۔ صوفیہ کے اپنائے سبز رنگ، نیز (خضر) اور اس حوالے سے دیومالائی قصے بھی یہودی اسرائیلی روایت کا حصہ ہیں، جن کا ذکر پیغمبر موسیٰؑ کے بارے میں وارد قرآنی آیات کی تفسیر میں بھی پایا جاتا ہے)....... بعض صوفیہ نے کہا کہ انھوں نے 'اسمِ اعظم' کو پا لیا، اور اپنے خاص الخاص حلقوں میں اس کا 'ذکر' بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں غور کیا جائے تو مسلم صوفیہ میں یہاں بھی شیعہ اور سنی کی تقسیم واضح طور پر نظر آتی ہے۔ خدا کا ایک صفاتی نام (علی) بھی ہے۔ (علی) پیغمبرؐ کے چچا زاد، نیز داماد اور حسنین (حسنؓ اور حسینؓ) کے والد کا نام بھی ہے، جن سے علوی، شریف اور سید کے نسبی، سیاسی اور مذہبی سلسلے نکلے۔ (تفصیل کے لے دیکھیے: ''تحقیقِ سید و سادات'' از محمود احمد عباسی)۔ پھر جب علیؓ (بن ابی طالب) کو خدائی طاقتوں کا حامل، نیز 'مشکل کشا' قرار دیا جاتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ شیعہ یا شیعی رجحان رکھنے والے صوفیہ کے نزدیک (علی) 'اسمِ اعظم' ہے، خاص طور پر

جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کے علاوہ باقی سارے بنیادی صوفی سلسلے حسن بصریؒ کے توسط سے علیؑ بن ابی طالب تک پہنچتے ہیں، (یہ الگ بات ہے کہ تاریخی طور پر حسن بصریؒ کا علیؑ بن ابی طالب سے 'لقاء' ثابت نہیں)۔ دیومالائی مذہبی تاریخی روایات میں (علی)، (ایلی) اور (ایلیا) کا ذکر ایک بنیادی نام کے طور پر ملتا ہے۔ ایسی ہی بعض دیومالائی روایات میں پیغمبر موسیٰؑ کو طُور کے پہاڑ پر اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کو معراج کے قصے میں اسی نام کے حامل کی آواز یا چاپ سنائی دیتی ہے۔ مزید یہ کہ اہلِ تشیّع کا ایک داخلی فرقہ (نُصَیرِیة) علیؑ بن ابی طالب کو خدا سمجھتا اور بر ملا اس کا اعلان کرتا تھا۔ (خواجہ حیدر علی آتش کا یہ مصرع اسی پسِ منظر میں کہا ہوا ہے کہ: دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا)۔ اس کے بالمقابل سنی اہلِ تصوف (جن میں نقشبندی سلسلے کے صوفیہ شامل ہیں، جو اپنا سلسلہ پیغمبرؐ کے ایک دوسرے ساتھی ابوبکرؓ بن ابی قحافہ سے ملاتے ہیں) کے نزدیک 'الہٰ' کا اسم معرفہ 'اللہ'، جو خدا کا ذاتی نام قرار دیا گیا ہے، 'اسمِ اعظم' ٹھہرا۔

۸۔ حاشیہ از مترجم: پرانے انداز کے معاشروں میں یا ان میں پائی جانے والی سماجی روایات کے تسلسل میں لوگوں کے نام جنگلی حیات اور فطرت کی اشیا کے ناموں پر یا ان کی نسبت سے بھی رکھے گئے، جیسے 'ابو جندل' اور 'ہنری راک'۔ 'جَندَل'، اور 'راک' چٹان کے معنوں میں ہیں۔ مصر کے ایک ماہرِ تعلیم اور نقاد کا نام 'عبدالقادر القط' ہے۔ 'قِط'، بمعنی گربہ، بظاہر لقب ہے، اور ممکن ہے آباء و اجداد میں سے کسی کا نام اور اس لحاظ سے خاندانی یا قبائلی نام بھی ہو۔ مصر ہی میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کا نام 'عبدالحمید شیحہ' ہے۔ شِیح یا 'شِیحة' ایک پودے کا نام ہے۔ ہمارے ہاں 'شیر' نام رکھنے کی ایک وجہ روایات میں علیؑ بن ابی طالب کو 'حیدر' کا لقب ملنے کا تذکرہ ہے، جو شیر کا ایک نام ہے۔ انھی دیومالائی روایات میں علیؑ بن ابی طالب کا شیر پر سواری کرنے اور بطور کوڑا سانپ ہاتھ میں لیے ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اسی مناسبت سے بعض اہلِ تشیّع اپنے ہاں شیر اور سانپ پالتے ہیں (جو ظاہر ہے ان کا ذاتی فعل ہے)۔ ایک نام 'ذوالفقار' بھی عام طور پر اس وجہ سے رکھا جاتا ہے کہ یہ علیؑ بن ابی طالب کی تلوار کا نام تھا۔ اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پاکستانی فوج میں عام طور پر 'نعرۂ حیدری' کا چلن ہے، اور سب سے اعلیٰ تمغہ 'نشانِ حیدر' ہے۔ اس کی وجہ علیؑ بن ابی طالب کی بہادری کے بارے میں مبالغہ آمیز، بلکہ دیومالائی انداز کی تاریخی روایات اور ان کی مقبولیت ہے۔ ورنہ بہت سے دیگر اصحاب و غیر اصحابِ رسولؐ کی شجاعت علیؑ بن ابی طالب سے کسی طور کم نہ تھی۔ قلعہ ہائے خیبر کی فتح بھی عام طور پر ان روایات میں علیؑ بن ابی طالب سے منسوب کی جاتی ہے، جو تاریخی حقیقت سے مختلف بات ہے۔ علیؑ بن ابی طالب کی جسمانی طاقت کو نہایت مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہوئے حقیقت اور افسانے کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثالاً یہ بات دیکھیے کہ ایک بار غصے میں علیؑ بن ابی طالب نے اپنی تلوار نیچے زمین پر ماری، جس پر خدا نے جبریل سے کہا کہ فوراً جا کر اس تلوار کی ضرب کا زور روکو، ورنہ زمین کٹ جائے گی۔ جبریل نے اپنا مضبوط پَر اسی وقت تلوار کے سامنے کر دیا، پَر کٹ گیا، مگر تلوار کا زور کم ہوتے ہوتے بھی اس کی نوک زمین کی پاتال تک پہنچ گئی۔ یا یہ کہ دورانِ جنگِ خیبر علیؑ بن ابی طالب کے ہاتھ سے ڈھال گر گئی تو انھوں نے قلعے کے دروازے کا ایک کواڑ اکھاڑ کر بطور ڈھال استعمال کیا۔ (مرزا حیرت دہلوی کی ''کتاب الشہادت'' میں ان قصوں کی تفصیل دیکھیے)۔ یوں علیؑ بن ابی طالب کو بطور 'سپرمین' پیش کیا جاتا ہے۔ 'داستانِ امیر حمزہ' کی طرح ان روایات کو اگر 'داستان سرائی' کے ضمن میں بھی رکھا جائے، تو بھی اس سے بجائے علیؑ بن ابی طالب کی شجاعت وعظمت ظاہر ہونے کے، ذم کے بہت سے پہلو

نکلتے ہیں۔ (حقیقت کی تلاش میں حق و مخالفت میں پائی جانے والی روایات کے طومار کا جائزہ لیا جائے تو علیؓ بن ابی طالب کی جسمانی کیفیت حیران کن حد تک مختلف ثابت ہوتی ہے)۔ علاوہ بریں، اس سے فرقہ جاتی منافرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ (ضمناً) پاکستان دستوری لحاظ سے سنی یا شیعہ ریاست نہیں، بلکہ ایک مسلم ریاست قرار دی گئی ہے۔ مزید برآں، یہ اسلامی ملک ایک جیسا تیسا دستور بھی رکھتا ہے، اور مثلاً سعودیہ یا ایران کی طرح کسی فقہ کا پابند نہیں۔ البتہ، یہاں مسلمانوں کو اپنے داخلی مذہبی اختلافات کے تحت اپنے اپنے جیسے کچھ فقہی قوانین پر انفرادی لحاظ سے عمل پیرا ہونے کی قانونی اجازت ضرور حاصل ہے، جس سے 'داخلی غیریت' اور تنفر کی خلیج میں کمی آنے یا ہم آہنگی پیدا ہونے کی بجائے اضافہ ہی ہوتا آیا ہے۔ پاکستان کو شیعی ریاست قرار دیا جائے تو غیر شیعہ کی سماجی و غیرسماجی اور مادی یا معنوی persecution کی شاید گنجائش نکلتی ہو۔ یا اسے اگر سلفی/ اہلحدیث (یا معروف معنوں میں وہابی) ریاست قرار دیا جائے تو اسی منطق کے تحت شاید غیر وہابی لوگوں کی persecution کم سے کم انٹیلی جنس مقاصد کے لیے روا رکھی جا سکتی ہو۔ بعینہٖ اگر یہ دیوبندی/ تبلیغی ریاست قرار پاتی ہے، یا پھر قانونی طور پر اسے سنی/ بریلوی اور صوفی/ پیرانہ ریاست بنایا جاتا ہے، تو مذکورہ منطق کے اسی طرح لاگو کرنے کی شاید گنجائش نکلے۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے، تو سماجی، مذہبی، سیاسی، حکومتی اور انٹیلی جنس سطحوں پر مادی ظاہری وسائل اور معنوی خفیہ ہتھکنڈوں سے کسی گروہ، طبقے، خاندان یا افراد کی persecution کیونکر روا ٹھہرتی ہے؟ پاکستان ایک یکسر سیکولر ملک قرار دیا جائے تو بھی یقیناً کسی ضابطے اور اصول کی پابندی لازم ہو گی۔

۹۔ أبوداؤد، السنن، کتاب الادب۔

۱۰۔ مسلم، الصحیح، کتاب الآداب۔

۱۱۔ http://www.patel102.freeserve.co.uk/

۱۲۔ حاشیہ از مترجم: 'جاہلیت' (جاهلية) ایک اصطلاح ہے، جس سے مراد یکسر جہالت نہیں۔ استعمال کے لحاظ سے جہل' یا 'جہالت کا لفظ 'علم' کے علاوہ 'حلم' کا بھی متضاد شمار ہوتا ہے، اور یوں اس کا اطلاق 'جنگ' پر بھی کیا جاتا ہے۔ زمانۂ ماقبلِ اسلام کو 'جاہلیت' کا زمانہ اس لیے کہا گیا کہ وہ کسی برتر اصول کو خاطر میں نہ لانے کا دور تھا۔ ورنہ وہ لوگ کچھ ایسے جاہل بھی نہ تھے۔ علوم ان کے ہاں بھی پائے جاتے تھے، اور ان کا خرد مندانہ استعمال بھی وہ جانتے تھے۔فضل و دانش کی محافل اس وقت بھی منعقد ہوتی تھیں۔ شاعری، جو عربوں کے احوال و وقائع کی دستاویز بھی ہے، ایسی پختہ شکل میں ملتی ہے کہ جاہل لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ جب کہ اس شاعری کے بہت کم حصے کی صحت (authenticity) مشکوک (apocryphal) ہے۔ (ملاحظہ ہو: ''**مصادر الشعر الجاهلی**'' از ناصر الدین الأسد)۔ محض قوتِ حافظہ ہی ان کے پاس نہ تھی، وہ لوگ، کم کم سہی، مگر لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے، اور بعد میں قرآن بھی صرف حافظے یا پتوں، چھالوں پر منتشر اجزا کی شکل میں نہیں، بلکہ تاریخی اعتبار اور خود قرآن کی داخلی شہادت کے لحاظ سے اس زمانے میں پائے جانے والے ایک خاص کاغذ 'رَق' (vellum) کے 'منشور' (کھلے) پارچوں پر لکھا، پیغمبرؐ کی وفات کے وقت موجودہ ترتیب کے مطابق کتابی شکل میں موجود تھا، جسے '**المصحف الإمام**' (بنیادی نسخہ) کہتے تھے۔ جامع و مرتبِ قرآن خود پیغمبرؐ تھے۔ خلفاء محض 'ناشرینِ قرآن' تھے، اور منتشر اجزا اور ان میں انفرادی حافظے پر بھروسے کے باعث جنم لینے والے اختلافات کو ختم کرنے والے۔ قرآن کی مختلف قرائتوں کا شاخسانہ لوگوں کے پاس انھی منتشر اجزا (اور ان پر مبنی

روایات) کی وجہ سے سامنے آیا، اور بعد میں مستشرقین (یعنی 'غیر') کے سامنے مسلمانوں کا معذرت خواہانہ رویہ بھی۔ (قرآن کی جمع و تدوین اور قراء ات کے سلسلے میں ملاحظہ ہو: تمنّا عمادی کی تصنیف ''جمع القرآن''، نیز ''اعجاز القرآن و اختلافِ قراء ت'' از مصنفِ سابق، اور غلام احمد پرویز کی ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'')۔....... رہی (جاہلیت) تو وہ بعد از اسلام اب بھی پائی جاتی ہے، اور اس میں مسلمانوں کی 'شرکت' بھی مقامی و عالمی ہر دو سطح پر خاصی بھر پور ہے، جو یقیناً شرم کی بات ہے۔

۱۳۔ حاشیہ از مترجم: عربوں کے ہاں دیومالا یا صنمیات (mythology) کا تصور یونانی، رومی، مصری، بابلی اور ہندوستانی صنمیات سے ذرا ہٹ کر رہا ہے۔ درحقیقت عربوں کے مشہور اصنام قبائلی خوبیوں کے حامل (معروف معنوں میں 'برگزیدہ و خدا رسیدہ') اشخاص، اور فطرت کی بعض اشیا کے نام پر رکھے قبائل کے نام تھے، جن کی تقدیس نے مرورِ وقت کے ساتھ ان کے بت ترشوائے، جو کعبۂ مکہ کی مرکزی حیثیت کے پیشِ نظر (بیش تر) اس میں رکھے گئے۔ عربوں میں رومی تہذیب و ثقافت سے کسی قدر آشنائی کے باوجود، انفرادی یا روایتی لحاظ سے باقاعدہ مجسمے تراشنے کا رواج تھا نہ وہ لوگ مجسمہ سازی سے بطور فن واقف تھے۔ کعبے میں رکھے گئے بت بھی ان گھڑ انداز میں تراشے ہوئے تھے۔ دور سفر میں کسی پر کوئی بپتا پڑتی اور وہ اپنے روحانی/ نفسیاتی کرب سے نجات پانا چاہتا، تو زیادہ سے زیادہ اپنے کھانے کے ستو کو جیسے تیسے بت کی شکل دے کر ماتھا ٹیک لیتا۔ دیگر صنمیات کی طرح مختلف خداؤں یا دیوتاؤں کی تقسیم (جیسے سمندر کے خدا یا پہاڑ کے خدا) کا کوئی واضح تصور ان کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ خالقِ خیر اور خالقِ شر (یزداں اور اہرمن) یا بڑے اور سردار خدا (جیسے یونانی دیومالا میں 'زیوس') کے تصور سے قدرے مختلف عربوں کے ہاں ایک ایسے برتر خدا کا تصور پایا جاتا تھا جس کا مجسمہ نہیں تراشا گیا۔ البتہ، اس کا گھر ضرور بنایا گیا تھا۔ اسے وہ (اللّٰہ) کا نام دیتے تھے، جو (إلٰہ) کے لفظ سے اسم معرفہ ہے، جس کے بنیادی معنی 'سمجھ میں نہ آنے والی تحیر زائی' کے ہیں۔ باقی خداؤں یا (آلھة) کو اس (اللّٰہ) سے تقرب کا وسیلہ بھی قرار دیا جاتا تھا۔ جادو، رمل، کہانت، اور جھاڑ پھونک کی witchcraft کا ابتدائی معاشرہ ہونے کے لحاظ سے ان کے ہاں ضرور رواج تھا۔ جنّوں اور ان کی خارقِ عادت (supernatural) قوت کے وہ قائل تھے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے، جو شاعری الہام کرتا ہے۔ اسے وہ **شیطان الشاعر** (شاعر کا شیطان) کہتے تھے۔ اسی دیومالائی تصور کے تحت بعد کا ایک شاعر ابوالنجم العجلی اپنے مخالف قبیلے کے شاعر کی ہجو میں کہتا ہے: (یاد رکھو! مَیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہوں۔ ایک تم کیا، سارے شعراء میرے سامنے ہیچ ہیں، کہ ان کا شیطان مؤنث ہے، جب کہ میرا شیطان مذکر۔ کوئی بھی شاعر میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتا، اور مجھے دیکھتے ہی کنّی کترا کر نکل جاتا ہے۔ بعینہٖ جیسے چاند کو دیکھتے ہی ستارے پسِ منظر میں جا چھپتے ہیں)۔ [**إنّي و كلُّ شاعرٍ من البشر / شيطانه أُنثىٰ وشيطاني ذَكَر / ما رآني شاعرٌ إلّا استتر / فعلَ نجوم اللّيل عايَنَّ القمر**]۔ اسلامی دور میں پیغمبرؐ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد ایک طرف روایتِ حدیث کے شوق میں اور دوسری جانب عربوں کے قبائلی تعصب اور اپنے مخالف حکومتی خانوادے کی دشمنی، نیز اہلِ فارس کی انتقامی کارروائی کے زیرِ اثر عرب اور غیر عرب مسلمانوں میں مخصوص طرز کی ایک دیومالا تشکیل پا گئی، جو بیش تر شیعی روایات پر مشتمل ہے۔ تاہم اہلِ سنت کی روایات کا معتد بہ حصہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔.........(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اسماعیل احمد ادہم کا مقالہ: 'من مصادر التاريخ الإسلامي'، مشمولہ 'المؤلفات الكاملة'، مرتبہ: احمد ابراہیم الہواری، جلد سوم بعنوان: ''قضایا

ومناقشات''؛ ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' از حبیب الرحمٰن کاندھلوی ؛ نیز علامہ اقبال کی آمدِ مہدی اور نزولِ عیسیٰؑ کے بارے میں رائے، اور صحیح بخاری میں موجود نزولِ مسیحؑ والی روایات پر اقبال کی درخواست پر 'روایت و درایت' کے لحاظ سے تمنا عمادی کی تنقید؛ ضمناً: مصر کے ایک سابق شیخ الازہر محمود شلتوت بھی رفع و نزولِ مسیحؑ کی بجائے از روئے قرآن وفاتِ عیسیٰؑ کے قائل تھے؛ خاص طور پر شیعی دیومالائی مذہبی رسوم کے لیے دیکھیے: محمود احمد عباسی کا تحریر کردہ ''بادشاہ بیگم اودھ'' کے اردو ترجمے کا مفصل دیباچہ؛ ''کتاب الشہادت'' از مرزا حیرت دہلوی ؛ عجم کے انتقام کے حوالے سے: غلام احمد پرویز کی تالیف کردہ عمرؓ بن خطّاب کی سوانحِ حیات ''شاہکارِ رسالت'' کا آخری باب بعنوان: 'شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا تیرے بعد'؛ ابوالخیر اسدی کی ''اسلام کی عجمی تعبیر''؛ نیز تصوف کے حوالے سے: ''ایمانِ خالص'' از کیپٹن مسعود الدین عثمانی کا پہلا حصہ؛ غلام احمد پرویز کی ''تصوف کی حقیقت''، اور یوسف سلیم چشتی کی ''تاریخِ تصوف''، بشمول علیٰحدہ شائع کردہ کتابچہ بعنوان: ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''۔ آخر الذکر مبسوط کتاب (تاریخِ تصوف) کا متوازی تقابل اگر عالمی دیومالا پر آرزو چودھری کی تصنیف ''داستان کی داستان'' سے کیا جائے تو صورتِ حال بڑی حد تک نکھر آتی ہے؛ جنّوں کی خارقِ عادت طاقتوں کے حوالے سے ملاحظہ ہو: ''**آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان**'' از بدر الدین بن ابی عبداللہ الشبلی)............... یہی دیومالائی، نیز تعصب و انتقام کا عنصر عام تاریخ کی اور دستاویزی کتابوں پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس سلسلے میں تمنا عمادی کا تاریخِ طبری پر تفصیلی مضمون، اور ''نہج البلاغہ، قرآن اور تاریخ کی روشنی میں'' از محمود احمد عباسی کافی معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ابنِ خلدون کی تاریخ سے وہ چند صفحے جو واقعۂ کربلا کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں، اس کے ابتدائی نسخے ہی سے نکال کر ضائع کر دیے گئے، اور واقعے کی وہی روایات عام طور پر تاریخ کی کتب میں درج ہیں جن سے سیاسی مذہبی منافرت کو ہوا دینے کا موقع ملا۔

۱۴۔ حاشیہ از مترجم: عرب ممالک میں عیسائیوں اور یہودیوں کے نام بھی بڑی حد تک مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک جیسے نام پائے جاتے ہیں۔ اردو ادب کے ایک ہندو محقق آنجہانی مالک رام نے اپنے بیٹوں کے نام 'آفتاب' اور 'سلمان'، اور ایک بیٹی کا نام 'بشریٰ' رکھا۔ یہ عام طور پر برِصغیر میں مسلمانوں کے نام ہوتے ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے مالک رام کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، اور نہ ان کی اولاد مسلمان ہے۔ مذکورہ نام محض عربی اور فارسی الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مالک رام، صاحبِ علم محقق تھے۔ وہ اپنی تحقیقی دلچسپی کے لیے عربی زبان سے بھی واقف تھے۔ مذہبیات پر بھی ان کا مطالعہ تھا، اور اسی مناسبت سے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی ''عورت اور اسلامی تعلیم'' کے نام سے شائع ہوا، جس پر عبد الماجد دریابادی کو اپنے تبصرے میں کہنا پڑا کہ اگر مصنف کا نام مذکور نہ ہوتا تو اسے یقیناً کسی مولانا عبدالمالک کی تصنیف قرار دیا جاتا۔

۱۵۔ http://www.submission.org/muslim-names.html

۱۶۔ حاشیہ از مترجم: ادویات کے Generic یا بنیادی نام بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

۱۷۔ ﴿**وعلّم آدم الأَسماء کلّھا، ثمّ عرضھم علی الملائکة، فقال: أَنبئوني بأَسماء ھؤلاء إن کنتم صادقین**﴾ [البقرة: ۳۱]

۱۸۔ دیکھیے: "Ism"، از H Fleisch، در The Encyclopedia of Islam، (نیا ایڈیشن)، جلد 4، (لیڈن: Brill، 1997ء)، صفحہ 181۔ الأنباری کی '**کتاب الإنصاف**' کا حوالہ دیتے ہوئے Fleisch وضاحت کرتا ہے کہ عربی گرامر کے کوفی مکتبۂ فکر کے نزدیک 'اسم' کا لفظ (و س م) کے مادے سے مشتق ہے، جب کہ بصری

مکتبۂ فکر کے ہاں اس کا اشتقاق (س م و) سے ہے۔

۱۹۔ لغت نامہ دہخدا، از علی اکبر دہخدا ، (تہران، 1334 ہجری شمسی)، جلد 14، صفحہ 197۔ حاشیہ از مترجم: عربوں کا اہلِ یونان سے تعارف پہلے فارسی اور پھر رومی، ہر دو اقوام کے توسط سے ہوا۔ یوں ان ہاں دونوں طرح کے نام استعمال کیے گئے۔ (**یونان**) کا لفظ **ملک**، نیز باشندوں (واحد: **یونانی**، نیز جمع: **یونانیون**) پر بھی منطبق ہوا، جب کہ (**اِغریقیة/ اَغریقة**) کا لفظ **ملک** کے لیے اور (**اغریق**) باشندوں (واحد: **اِغریقی**، نیز جمع: **اِغریقیون/ اَغارقة**) کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ دراصل Ghraikos کی تعریب ہے، جو یونان کی ایک مشہور شخصیت کا نام تھا، جس سے قدیم یونانی موسوم ہوئے۔

۲۰۔ The Oxford Compact Dictionary، (آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1971ء)، صفحہ 2639۔ حاشیہ از مترجم: ہمارے ہاں یہ نام غلطی سے 'ہاجرہ' مشہور ہے، اور اسی پر بعض خواتین کا نام بھی رکھا جاتا ہیں۔ جب کہ یہ نام عربی نہیں، عبرانی ہے، اور آخر میں (ہ) کے بغیر اور جیم پر زبر کے ساتھ ہے۔ (ضمناً) اُمَوی قبیلے کے سردار اور فتحِ مکہ کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ کے ایک ساتھی ابوسفیانؓ کی بیوی کا نام بھی سہواً 'ہندہ' لکھا اور بولا جاتا ہے۔ جب کہ یہ 'ھند' (برِّ صغیر/ ہندوستان) کے نام سے لیا گیا اور اسی طرح (ہ) کے بغیر بعض عورتوں کا نام رکھا گیا۔ واضح رہے کہ ممالک کے نام (انگریزی کی طرح) عربی میں بھی مؤنث شمار ہوتے ہیں۔

۲۱۔ Hagarism: The Foundation of the Islamic World، از Patricia Crone اور Michael Cook، (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1977ء)۔

۲۲۔ مثال کے طور پر دیکھیے: Patriarch Sphronios کا 634ء میں یروشلم میں دیا گیا خطبہ، محولہ در Syriac Views of Emergent Islam، از S P Brock، [شائع شدہ] در Studies in the First Century of Islamic Society، از G H A Juynboll، (Carbondale: Southern Illinois University Press، 1980ء)، صفحہ 9۔

۲۳۔ حاشیہ از مترجم: یہ نام بھی عربی نہیں، بلکہ عبرانی ہے، اور راء پر شد کے بغیر ہے۔ نیز عربی میں یہ (سارای) بھی لکھا جاتا ہے۔

۲۴۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1239۔

۲۵۔ A Short History of the Saracens، از Syed Ameer Ali، (لاہور: پراگریسو بکس، n.d. [1997ء)۔ ابتداء 1898ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب مسلسل اسی عنوان سے شائع ہوتی آئی ہے۔

۲۶۔ Webster Third New International Dictionary، (Chicago: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، 1966ء)، جلد 3، صفحہ 2014۔

۲۷۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 2639۔ اصطلاح کے مختلف اشتقاقات کے تجزیاتی جائزے کے لیے دیکھیے: "Saracens"، از Irfan Shahid اور C E Bosworth، [شائع شدہ] در The Encyclopedia of Islam، نیا ایڈیشن، جلد 9، (لیڈن: Brill، 1997ء)، صفحہ 27-28۔

۲۸۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 2639؛ اور Webster، جلد 3، صفحہ 2014۔

۲۹۔ حاشیہ از مترجم: یہاں یہ تصریح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دور میں غلام اور لونڈیوں کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ عالمی سطح پر آخری بار امریکا کی تعمیر میں جبری مزدوری کے لیے باقاعدہ طور پر افریقی باشندوں کو غلام بنایا

گیا۔ (اگرچہ عسکری و سیاسی استعمار بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے، جس کا باقاعدہ خاتمہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ اسی طرح علاقائی اور عالمی لحاظ سے زمین کی جاگیردارانہ اور خدمات کی سرمایہ دارانہ ملکیت، اور محنت کا استحصال بھی غلامی ہی ایک شکل ہے۔ نیز جبراً قرآن حفظ کرانے کے لیے بھی بعض لوگ قید کر کے یا زنجیر پہنا کر ایک طرح سے غلام ہی بنائے جاتے ہیں۔ راقم اس کا چشم دید گواہ ہے)۔ دنیا میں قانونی لحاظ سے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت نہیں۔ اسلام میں یہ رواج بتدریج ختم کر دیا گیا۔ اب جنگ میں بھی کسی کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ بعض فقہاء نے سہواً غلامی کا یہ دروازہ کھلا بتایا ہے۔ جب کہ تاریخی لحاظ سے جنگ کے قیدیوں کو گھروں میں اس لیے رکھا گیا، اور رواجاً ان سے خدمت کا کام لیا گیا کہ اس وقت جنگی قیدیوں کے لیے باقاعدہ جیلیں یا کیمپ موجود نہ تھے۔ غلام احمد پرویز کی ایک مشترکہ تالیف ''قتلِ مرتد، غلام لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت'' میں اس مسئلے کو اس کے سیاق میں واضح کیا گیا ہے۔

۳۰۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1239۔

۳۱۔ سابقہ حوالہ۔

۳۲۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1239۔

۳۳۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 2639۔

۳۴۔ Collins Spanish-English English-Spanish Dictionary، (نیو یارک: Harper Collins Publishers، 1993ء)، صفحہ 659۔

۳۵۔ حاشیہ از مترجم: نسلوں اور قوموں کا تہذیبی، ثقافتی ٹکراؤ اسی نہج پر چلتا ہے، اور اس سلسلے میں 'دوسرے' کو نیچا دکھانے کے لیے ہر حیلہ و منافقت سے کام لیا جاتا ہے، اور تاریخ تک مسخ کر دی جاتی ہے۔ حال آں کہ تہذیب و ثقافت کے حمّام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ وہاں سبھی 'پوتّر پاپی' ہیں۔ اسی تہذیبی ثقافتی خود غرضی یا منافقت کو شاعر لوگ 'رند اور شیخ'، 'مے گسار اور واعظ' کے استعارے استعمال کرتے ہوئے طشت از بام کرتے رہے ہیں۔ (کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ، اور کہاں واعظ :: پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے)۔ (واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند :: چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند)۔ (ہیچ کس بے دامنِ تر نیست، اَمّا دیگراں :: باز می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم)۔ بڑے فکری تناظر میں 'یزداں و اہرمن' اور 'خدا و ابلیس' کے استعارے استعمال کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے ہاں 'ابلیس' اور ملٹنؔ کے ہاں 'Satan' کا کردار ''یزداں' اور 'God' سے بڑھ کر اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ اسی تسلسل میں آگے چل کر خدا اور انسان کے مابین ایک طرح کی تخلیقی جنگ نظر آتی ہے، جو 'خدا اور انسان' کے روایتی تصور سے ہٹ کر ہے۔ اقبالؔ کے 'محاورہ مابین خدا و انسان' میں یہ تخلیقی جنگ واضح اور انتہائی طور پر سامنے آتی ہے۔ (تو شب آفریدی، چراغ آفریدم :: سفال آفریدی، ایاغ آفریدم ....من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم :: من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم)۔ اس سلسلے میں 'شریعت اور طریقت' یا 'عقل اور عشق' میں 'صحبتِ موج و کنار' کی (دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من) والی آویزش کے تحت سماجی، سیاسی اور دیگر احوال و وقائع اور واردات و مسائل میں 'خیر و شر'، 'درست اور غلط' یا 'theism اور atheism' کے روایتی تصور کو ایک طرف کرتے ہوئے منافقتوں، بے جا بندشوں اور دراندازیوں کے گورکھ دھندے کا پردہ چاک کیا جاتا ہے، اور 'داخل و خارج' یا 'موضوع و معروض' کو بایں طور ہم آہنگ کرنے پر توجہ مبذول کی جاتی ہے کہ 'سطحیت اور گہرائی' کی وہ روایتی

عینک فریبِ نظر کا باعث نہ بنے جو 'بوالہوسی' اور 'شیوۂ اہلِ نظر' میں فرق کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ (در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق :: ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن)۔ (در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست)۔ اس میں سہل انگاری سے کام نہیں چلتا۔ 'دُرِ ابلق' یونہی تخلیق نہیں ہو جاتا۔

۳۶۔ Webster، جلد 2، صفحہ 1471۔

۳۷۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1846۔

۳۸۔ سابقہ حوالہ۔

۳۹۔ سابقہ حوالہ۔

۴۰۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 1467۔

۴۱۔ Boorde نے 1547ء میں Barbary کے باشندوں کا ذکر کیا ہے جو white moors اور black moors کہلاتے تھے۔ دیکھیے: سابقہ حوالہ، صفحہ 1847۔

۴۲۔ لغات میں ہمیں اس نسلی امتیاز کی بہت سی دوسری مثالیں ملتی ہیں: مذکورہ صدر آکسفورڈ ڈکشنری میں صفحہ 1846 پر درج ہے کہ (1632ء میں) Lathgo ایک قصبے کا ذکر کرتا ہے جہاں عیسائی، عرب اور Moor آباد ہیں۔

۴۳۔ Webster، صفحہ 1467؛ Hobson-Jobson، از H Yule اور A L Brunell، (لندن: Routledge، 1986ء)، [ابتداء شائع شدہ در 1886ء]، صفحہ 581۔

۴۴۔ حاشیہ از مترجم: اسپین کے مسلم طرزِ تعمیر اور مصوری کو بھی Moresque کا نام دیا گیا ہے۔

۴۵۔ Collins Spanish Dictionary، (نیویارک: Harper-Collins، 1992ء)، صفحہ 490۔

۴۶۔ سابقہ حوالہ۔

۴۷۔ Hobson-Jobson، از Yule & Brunell، صفحہ 582۔

۴۸۔ سابقہ حوالہ۔

۴۹۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1846۔

۵۰۔ سابقہ حوالہ۔

۵۱۔ Hobson-Jobson، صفحہ 581۔

۵۲۔ مثال کے طور پر دیکھیے: "mussulwomanish"، (Dryden در 1668ء)، اور "A poor Mussulwoman"، (Byron در 1817ء)۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1882ء۔

۵۳۔ سابقہ حوالہ۔

۵۴۔ سابقہ حوالہ۔

۵۵۔ فرہنگِ فارسی، از محمد معین، (تہران، 1360ء ہجری شمسی)، جلد 3، صفحہ 4117۔

۵۶۔ فرہنگِ آنند راج، بحوالہ: لغت نامہ دہخدا، جلد 44، صفحہ 428۔

۵۷۔ حاشیہ از مترجم: لفظ (مسلمان) کی توضیح میں (مششدر) کی مثال پیش کرنا کہ یوں (ششدر) کی طرح (سلمان) کے ساتھ بھی میمِ مضمومہ (مُ) کا سابقہ لگا کر تفریس کی گئی ہے، اس لحاظ سے محلِّ نظر ہے کہ (مششدر) کے لفظ کو خود دہخدا نے (آنندراج)، (غیاث) اور (بہارِ عجم) کے حوالے سے "**تراشیدۂ فارسی زبانانِ عربی دان است**" لکھا ہے۔ نیز یہ وضاحت بھی کی ہے کہ (مششدر) کا یہ لفظ رباعی مجرد کے عربی صرفی باب

(فَعْلَلَة) سے اسمِ مفعول کے وزن (مُفَعْلَل) پر بنایا گیا صیغہ ہے، اور اس کا مطلب ہے '**ششدر شدہ**'، یعنی متحیر............... واضح رہے کہ 'ششدر' (شش + در) کا لفظ بھی غیر فارسی نہیں ہے، اور نرد کے کھیل میں ایک اصطلاح ہے، جسے مجازاً '**حیران و سرگردان**' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کائنات کی 'چھے جہات' کا مفہوم بھی دیتا ہے.............. لفظ (مُشَشْدَر) کی ایجاد یقیناً (ششدر) اور خاص طور پر اس سے متبادر لفظ '**ششدرہ**' (بمعنی تختۂ نرد، نیز بمعنی ششدر) کی مذکورہ عربی صرفی باب سے مشابہت کی بنا پر ہے، یعنی (شَشْدَرَہ) کو رباعی مجرد کا مصدر (**فَعْلَلَة**) اور (شَشْدَر) کو اس کا فعل (**فَعْلَلَ**) مان کر اسمِ مفعول کا صیغہ (**مُشَشْدَر**) بنا لیا گیا، نہ کہ میمِ مضمومہ (مُ) کا سابقہ لگا کر تفریس کی گئی، در آں حالے کہ خود اصل لفظ بھی فارسی زبان ہی سے متعلق ہے۔

۵۸۔ فرہنگِ نظامی، بحوالہ: لغت نامہ دہخدا، صفحہ 428۔

۵۹۔ H A R Gibb کی اسلام کے بارے میں کتاب کا عنوان: Mohammedanism: An Historical Survey، (نیویارک: New American Library، 1995ء)، اور Joseph Schacht کی اسلامی قانون پر کتاب کا نام: The Origin of Muhammadan Jurisprudence، (آکسفورڈ: Clarendon Press، 1950ء) اس بات کی [صرف دو] مثالیں ہیں۔

۶۰۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1882۔

۶۱۔ حاشیہ از مترجم: عربی میں (تُرك) کا لفظ بطور جمع استعمال کیا جاتا ہے، جس کا واحد (ترکی) ہے۔ تاہم اس کی مزید جمع (أتراك) بھی استعمال ہوتی ہے، جیسے (رُوم)، جو (رومی) کی جمع ہے، سے (أروام)۔

۶۲۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 1882۔

۶۳۔ سابقہ حوالہ۔

۶۴۔ سابقہ حوالہ۔

۶۵۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 1856۔

۶۶۔ سابقہ حوالہ۔

۶۷۔ Webster، جلد II، صفحہ 1491۔

۶۸۔ حاشیہ از مترجم: قرآن میں ذکر ہے: ﴿**إذ قال له ربّه: أَسْلِمْ، قال أَسلمت لربّ العالمين o ووصّىٰ بها إبراهيمُ بنيه ويعقوبُ: يا بَنِيّ، إنّ اللّٰه اصطفىٰ لكم الدين، فلا تموتُنّ إلّا وأَنتم مسلمون**﴾ [البقرة: ۱۳۱] .... اس کے ساتھ قرآن کے یہ الفاظ یعنی ﴿**لا إكراه في الدين**﴾ [البقرة: 256] بھی سامنے رکھے جائیں تو 'رُشد و غَیّ' کے 'تبیان' کے ساتھ ساتھ 'دین و مذہب' کے سلسلے میں 'جبر و اکراہ' کا بھی رد ہو جاتا ہے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ دیگر ادیان کے ساتھ روا داری ایک طرف، خود مسلمانوں کے اندر آپس میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مخصوص فرقہ جاتی عقائد کے تحت مذہب پر کار بند نہ ہو، تو اسے دائرۂ اسلام سے خارج یا زندیق قرار دینے کے فتوے اور تشہیر شروع کر دی جاتی ہے۔ حال آں کہ خود پیغمبر اسلامؐ نے اپنے ایک ساتھی کو اس بات پر سخت تنبیہ کی تھی کہ 'دورانِ جنگ (خواہ ڈر ہی کی وجہ سے) اسلام کا اعلان کرنے والے غیرمسلم کو تم نے کیوں قتل کیا؟ کسی کے من میں گھس کر فتویٰ دینے کا کوئی کیونکر مجاز ہو سکتا ہے؟' (ضمناً): غیرمسلم قرار دینے کی مجاز، فی زمانہ، عدالت قرار پاتی ہے، اور پھر مشاورتی عمل کے ذریعے پارلیمان۔ افراد زیادہ سے زیادہ رائے

دے سکتے ہیں۔ خود انھیں یا ان کی مختلف (مذہبی/ معاشرتی/ سیاسی) جتھے بندیوں کو تکفیر کا حق حاصل نہیں۔ قادیانیوں کو اگر کافر قرار دیا گیا، تو پہلے عدالت کے فیصلے سے، اور قیامِ پاکستان کے بعد پارلیمان کے ذریعے۔

۶۹۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 3743۔

۷۰۔ حاشیہ از مترجم: اردو میں بھی 'غربت' (عربی: غربة) اور 'غریب' کے الفاظ بنیادی طور پر انھی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ (ابنِ انشا کا قول ہے: ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا :: دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو / پھول دامن سے لپٹتے تھے تعطّر بکنار :: خار بے تاب تھے ہر راہ میں بچھ جانے کو)۔ 'نامانوس' کے معنوں میں عطفی ترکیب کے ساتھ 'عجیب و غریب' کا استعمال پایا جاتا ہے۔ 'اجنبی' کے مفہوم میں استعمال، شورش کاشمیری کے اس مصرعے میں دیکھیے: میں اس چمن میں غریب الدّیار ہوں شورش۔

۷۱۔ حاشیہ از مترجم: عرب ثقافت میں غُراب (کوّے) سے لیے گئے جدائی اور دوری کے علامتی معنوں کے برعکس، برِصغیر کی مقامی ہندی روایت میں کاگا (کوّا) آمد اور ملن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان دو متضاد معنوں کو برِصغیر کے عربی زبان کے ایک شاعر غلام علی آزاد بلگرامی نے ذیل کے دو اشعار میں اکٹھا کیا ہے: (**سمعتُ غُراب الهند يُضحي مبشِّراً :: بعود حبيبٍ، يا له من مبشّرٍ! / ألا يا غُراب النجد، أنت شقيقه :: فما لك تُؤذي هائماً بالتطيُّر!**)۔ [جب میں ہندوستانی کوّے کی آواز سنتا ہوں تو مجھے وہ آمدِ محبوب کی بشارت دیتا ہوا کتنا بھلا لگتا ہے۔ مگر اسی وقت نجد کے 'غُراب' کی سمع خراش آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو میں تڑپ کر رہ جاتا ہوں، اور 'تصوّرِ جاناں' کا سارا لطف غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ او نجد و حجاز کے غُراب! تُو ہند کے اِس کوّے کا بھائی ہی تو ہے۔ تجھے کسی دل زدہ سے کیا بَیر ہے کہ اگر یہ اسے اپنی نیک فال سے خوش کرتا ہے تو فوراً تُو اپنی بدشگونی سے اسے دکھ پہنچانے لگتا ہے؟]۔

۷۲۔ **المُنجد فی اللغة**، (بیروت، 1973ء)، صفحہ 547۔

۷۳۔ Oxford Compact Dictionary، صفحہ 3743۔

۷۴۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 3744۔

۷۵۔ سابقہ حوالہ۔

۷۶۔ Webster، صفحہ 2597۔

۷۷۔ **المنجد**، صفحہ 547۔

۷۸۔ The Oxford English-Arabic Dictionary of Current Usage، (آکسفورڈ: Clarendon Press، 1980ء)، صفحہ 784۔

۷۹۔ A Dictionary of Modern Written Arabic (Arabic-English)، از Hans Wehr، مرتبہ: J Milton Cowan، (Weibaden: Harrasowitz، 1967ء)، صفحہ 710۔

۸۰۔ **المنجد**، صفحہ 13۔

۸۱۔ سابقہ حوالہ، صفحہ 53۔

۸۲۔ Hobson-Jobson، صفحہ 352۔

۸۳۔ سابقہ حوالہ۔

۸۴۔ Platts، صفحہ 1035۔

۸۵۔ Hobson-Jobson، صفحہ 93۔

۸۶۔ سابقہ حوالہ۔

۸۷۔ فیروز اللغات، (کراچی: فیروز سنز، 1964ء)، صفحہ 1014۔

۸۸۔ حاشیہ از مترجم: لاہور کا ایک اشاعتی ادارہ، 'گورا پبلشرز' ہے، جس کے مالک کا نام طاہر اسلم گورا ہے۔

۸۹۔ Platts، صفحہ 924۔

۹۰۔ Hobson-Jobson، صفحہ 388۔

۹۱۔ حاشیہ از مترجم: مصنف نے اہلِ مغرب کو دیے گئے ناموں کی فہرست میں 'ولندیزی' کا لفظ شامل کیا ہے۔ تاہم قصداً یا سہواً اس کی وضاحت نہیں کی۔ ولندیزی کا نام ہالینڈ کے لوگوں کو دیا گیا، جو انڈونیشیا پر حکمران رہے۔

۹۲۔ حاشیہ از مترجم: خود (عرب) یا (عربی) کا لفظ اپنے بنیادی اشتقاق کے لحاظ سے وضاحت و بیان کے معنی دیتا ہے۔ (ع ر ب) کے مادے سے مشتق الفاظ میں یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ (أعْرَبَ) کا مطلب ہے 'اظہارِ بیان کرنا'، جس کا مصدر (اعراب) ہے، جو لفظوں پر حرکات لگا کر انھیں بولنے یا پڑھنے، اور نتیجتاً مخاطب کے لیے قابلِ فہم بنانے پر دلالت کرتا ہے..........عربی میں ابتداءً (**إعراب**)، لفظ کے تمام حروف پر حرکات لگانے کو کہا جاتا تھا۔ بعد میں اب نحوی اصطلاح کے طور پر جملے میں کسی لفظ کے صرف آخری حرف کی حرکت کے لیے (**إعراب**) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ تمام حروف پر حرکات لگانے کو (**شکل**) یا (**تشکیل**) کہتے ہیں.......... فارسی میں بھی (عربی) کا لفظ اظہار و بلاغت کے مفہوم میں استعمال کیا گیا۔ (اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بے ادبی ست :: زباں خموش، ولیکن دہاں پر از عربی ست....... حافظ شیرازی)۔

۹۳۔ Wehr، صفحہ 593۔

۹۴۔ Supplement aux dictionaries arabs، از Dozy، (Leide، 1927ء)، جلد II، صفحہ 98۔

۹۵۔ دیکھیے: The Secret Literature of the Last Muslims of Spain، از Luce Lopez-Baralet، Islamic Studies,36:1، (1997ء)، صفحہ 21-38۔

۹۶۔ حاشیہ از مترجم: ہند، جو جزیرہ نمائے عرب سے دور واقع تھا اور زمانۂ ماقبلِ اسلام میں عرب تاجروں کا وہاں سمندر کے راستے آنا جانا رہا، نیز عربوں کی اہلِ ہند سے کوئی مخاصمت نہ تھی، تب (**هند**) ، (هنود) اور (هنادكة) کے الفاظ اپنے استعمال میں دوستی اور محبوبیت کا مفہوم دیتے تھے۔ عرب اپنی عورتوں کے نام بھی (**هند**) رکھا کرتے تھے۔ تاہم، اسلامی دور میں جب سندھ کے علاقے فتح ہوئے اور بعد میں وسط ایشیا سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں نے برِّ صغیر میں مغلیہ حکومت قائم کی، تو تعلقات کی نوعیت حاکم و محکوم میں بدل گئی۔ اس میں خوشگواری بھی آئی اور سخت مزاحمت کا سامنا بھی رہا۔ یوں ہندو کبھی دوست اور کبھی مسلمانوں کا دشمن قرار پایا۔ اس کے بالمقابل، 'فُرْس' (اہلِ فارس) اور 'رُوم' (بازنطینی باشندے)، اور عرب علاقے میں ان کی پروردہ حکومتوں میں باہم چپقلش تھی۔ ان عرب حکومتوں کے درباری مداح حلقے اپنی اپنی وابستگی کے تحت روم و فارس کا ذکر کیا کرتے۔ جہاں تک عربوں کے باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے ذکر کا تعلق ہے، تو آپس کی قبائلی آویزشوں کے باعث ان کی شاعری میں اپنے قبیلے پر فخر و مباہات کا اظہار اور مخالف قبیلے کی ہجو و مذمت کثرت سے پائی جاتی ہے۔اسلامی دور میں فارس اور ایشیائے کوچک کے علاقے مسلمانوں نے فتح کر لیے، اور ان کی بیش تر آبادی بھی مسلمان ہو گئی۔ تاہم، عربوں کے مقابلے میں غیر عرب عام طور پر کم تر سمجھے

جاتے تھے۔ البتہ، علم اور لغت دانی کے لحاظ سے غیر عرب ضرور پذیرائی کے مستحق بنے۔ اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کو (جنھیں ذمی یا اہل الذمہ کا نام دیا گیا) مختلف حکومتوں میں مختلف طور پر حقوق اور پذیرائی حاصل رہی۔ جب مسلمانوں کی حکومت جغرافیائی اعتبار سے وسیع تر ہو گئی اور دور دراز کے علاقے زیرِ نگیں آئے، نیز بہت سے ممالک کے ساتھ تجارتی اور علمی روابط قائم ہوئے تو اسی لحاظ سے 'غیر' کے تصور میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ آخر میں صلیبی جنگوں کے دوران عیسائی اور مسلمان باہم مقابل و حریف اور ایک دوسرے کے لیے 'غیر' قرار پائے۔ داخلی طور پر شروع ہی سے اموی اور عباسی ایک دوسرے کے حریف و 'غیر' تھے۔ اموی عربوں کے حامی رہے، جب کہ عباسی غیر عرب عناصر کے ذریعے حکومت حاصل کرنے پر ان کے سرپرست بنے۔ اس نوعیت کی ایک 'غیریت' 'علویوں اور غیر علویوں' میں بھی رہی، اور سیاسی آویزش کا جب مذہب پر اثر پڑا تو 'سنی اور شیعہ' کی باقاعدہ 'مغائرت' عمل میں آئی....... جہاں تک ناموں اور ان کے استعمال و تعریب کا تعلق ہے تو عربی میں اہلِ لغت کے مقررہ قوانین پر عمل کے علاوہ صوتی مناسبت اور ایک طرح کے لسانی ذوق کو بھی دخل تھا۔ جب کہ موجودہ دور میں تسمیہ و تعریب کے عمل میں یہ بات عام طور پر پیشِ نظر نہیں ہوتی، اور کبھی دوسرے کی صوتیات بھی اپنا لی جاتی ہیں۔ نیز ناموں کی تعریب زیادہ تر فرانسیسی زبان سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد انگریزی کا درجہ آتا ہے۔ Venice کو پہلے 'بُنْدُقِیَّة' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ (ادبی تحریروں میں اب بھی یہ نام ملتا ہے، جیسے شیکسپیئر کے ڈرامے Merchant of Venice کا عربی میں 'تاجر البندقية' کے نام سے ترجمہ کیا گیا)۔ جب کہ اب اس نام کو اسی طرح 'فينيسيا' لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ عربی میں واو، انگریزی W کی طرح labial یعنی محض ہونٹوں سے ادا ہونے والی آواز ہے، جب کہ V کا عربی مقابل فاء ہے، جو V ہی کے مانند نچلے ہونٹ اور اوپر والے دانتوں کے ساتھ مل کر labial dental آواز کے طور پر ادا کیا جاتا ہے)۔ ہندووں یا اہلِ ہند کو پرانی تحریروں میں هنود ('هندی' کی جمع) اور هنادكة ('هندوكي' کی جمع) لکھا گیا ہے۔ جب کہ آج کل انگریزی میں لکھے جانے والے نام Hindus کو بعینہٖ عربی میں منتقل کرتے ہوئے 'هندوس' لکھا اور بولا جاتا ہے، اور اسی سے واحد کو 'هندوسی' کہتے ہیں۔

۹۷۔ لغت نامہ دہخدا، جلد 14، صفحہ 197۔

۹۸۔ سراج اللغات، بحوالۂ سابقہ۔

۹۹۔ غیاث اللغات، بحوالۂ سابقہ۔

۱۰۰۔ سابقہ حوالہ۔

۱۰۱۔ اضافۂ مترجم از 'لغت نامہ دہخدا'۔

۱۰۲۔ غیاث اللغات، بحوالہ: لغت نامہ دہخدا، جلد 14، صفحہ 197۔

۱۰۳۔ تاریخِ نظائر، بحوالۂ سابقہ، جلد 14، صفحہ 197۔

۱۰۴۔ حاشیہ از مترجم: ایرانیوں کی عربوں کے ساتھ باہم آویزش سے ہٹ کر، ان کی اصل چشمک، روم کی ہم پلہ بادشاہت سے تھی۔ اس لیے، بطور 'غیر'، رومیوں کا ذکر یقیناً مخالفانہ انداز میں رہا۔ لیکن اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ جانے اور ایشیائے کوچک کے تُرک باشندوں کے مسلمان ہو جانے سے ایرانیوں کا ان سے تعلق (عام طور پر) صداقت میں بدل گیا، اور ترک لوگوں کی خوش شکلی و خندہ روئی کے اعتبار سے 'ترک' کا لفظ فارسی شاعری میں خوبصورت اور وجیہ و شکیل کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ (اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ

ما را :: بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را...... حافظ)۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں (ہندو) کا لفظ سیاہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جو اہلِ ہند کے سیاہی مائل ہونے کی بنا پر کہا گیا۔ تاہم، رام کے پجاری (برہمن) ان میں سرخ و سپید رنگت کے حامل تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ بیش تر آریانا (موجودہ افغانستان) اور کشمیر کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۰۵۔ A Dictionary of Urdu-Classical Hindi and English، از Platts، (Delhi: Manoharlal Oriental Book Reprint Corporation، 1977ء)، صفحہ 319۔

۱۰۶۔ سابقہ حوالہ۔

۱۰۷۔ حاشیہ از مترجم: آریائی حملہ آوروں نے برِصغیر میں ہندومت کی ابتدائی تشکیل میں حصہ لیا، اور ان کے زیرِ سایہ یہاں (جاتی سسٹم) متعارف ہوا، جس سے ذات پات کی تقسیم عمل میں آئی، اور ہر نئے حملہ آور کو خود میں ضم کرتے چلے جانے کی وجہ سے ہندو قوم 'اَکّال الاُمم' کہلائی۔ برہمن کی مذہبی جاتی نے، حکمران سپاہ جاتی (کھشتری) کی مدد سے ویش اور شودر کی غالب اکثریت کا مذہب کے نام پر بری طرح سیاسی، معاشی اور سماجی استحصال کیا۔ برہمنوں کے اس استحصال کے خلاف (بطور ایک غیرمحسوس ردِعمل کے) خود ایک کھتری شہزادے نے حکومت تیاگ دی، اور ایک مختلف تصورِ حیات و کائنات کے تحت بدھ مذہب کی بنیاد ڈالی، جو ہندو مت کے لیے ایک 'داخلی غیر' تھا، جسے پہلے پہل خوب رد کیا گیا۔ لیکن اشوکِ اعظم کے بدھ مت قبول کر لینے کے بعد ریاستی سرپرستی میں جب اس نئے مذہب کو عروج حاصل ہوا، اور برہمنوں کا اثر اور ذات پات کا جال کمزور ہونا شروع ہوا، تو اس داخلی حملہ آور یا 'غیر' کو رام کرنے کے لیے برہمن ذہن کی یہ ترکیب کارگر رہی کہ گوتم بدھ کی مورتی بنا کر مندر میں رکھ دی، اور بدھ کے پیروکاروں کو مورتی کی پوجا اور آپس میں بھائی چارے کی دعوت دی۔ اہنسا کی پھیر میں آ کر بدھ مت بھی اپنی الگ پہچان کے باوجود ایک طرح سے ہندو مت میں ضم ہوتا چلا گیا۔ اس طرح گوتم بدھ کی باقاعدہ پوجا شروع ہوئی، اور بدھ کی مورتی بنانا ہر بدھ بھکشو کی مذہبی تعلیم کی معراج قرار پایا، جس کے آثار پاکستان اور افغانستان کے علاقوں میں خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔ ٹیکسلا میں بدھ دانش گاہ کی باقیات اور سوات میں بدھ کے مجسمے اسی سلسلے کی یادگار ہیں۔ شنکر اچاریہ کے شاطرانہ فلسفے نے بعد ازاں باقاعدہ ہندو مت کے حق میں پانسا پلٹ دیا۔ کچھ یہی حال جین مت کا ہوا۔ مسلمان 'غیر'، البتہ، سخت جان ثابت ہوا، اور ہندوؤں میں اس طور پر ضم نہ ہو سکا۔ اس پر ہندو نے انھیں ملیچھ (یا ملچھ)، یعنی ناپاک / پلید کے سخت الفاظ سے یاد کیا، اور عسکری معرکوں کے ساتھ ساتھ خاموش داخلی آویزش بھی جاری رہی، جو نئے 'یورپی غیر' کے خلاف پہلے یکجان پیکار اور بعد میں برطانیہ کے برِ صغیر پر قبضے سے آزادی حاصل کرتے وقت پاکستان اور بھارت کی تقسیم کی صورت میں جغرافیائی علیٰحدگی پر منتج ہوئی۔ تاہم، مقامی ثقافت کے جادو نے ضرور اپنا اثر دکھایا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے بھی کھڑے پتھروں (یعنی مورتیوں) کے متوازی اب پڑے پتھروں (یعنی قبروں) کو پوجنا شروع کر دیا۔ نیز ذات پات کی تقسیم بھی بڑی حد تک برقرار رہی۔ شادی بیاہ کی اور دیگر رسموں میں 'مہورت' یا 'شبھ گھڑی' اور 'جنم پتری' یا 'کنڈلی' کی جانچ، نیز 'گوتر' کی پڑتال (خواہ بدلی ہوئی شکلوں یا اصطلاحوں میں ہو) ضرور کی جاتی ہے۔ جہاں تک پاکستان میں پائی جانے والی اقلیتوں یا غیرمسلموں کا تعلق ہے جو داخلی لحاظ سے 'غیر' شمار ہوتے ہیں، تو ان میں سکھ کمیونٹی، پارسی اقلیت اور عیسائی کسی نہ کسی طور نمایاں نظر آتے ہیں۔ سکھ یہاں اپنی مشہور زیارت گاہوں کے باعث، پارسی ایک منظّم اور

تعلیم یافتہ کمیونٹی کے طور پر، جب کہ عیسائی اپنی خاص سماجی حالت اور مخصوص سرگرمیوں کے سبب۔ پاکستان میں ہندو بھی موجود ہیں، خاص طور پر سندھ کے اندرونی علاقوں میں، لیکن بھارت اور پاکستان کے درمیان روایتی تاریخی مغائرت اور مسلسل آویزش کے باعث ہندو نمایاں نظر نہیں آتے۔ یہاں فقط عیسائی کمیونٹی کے حوالے سے اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں عمومی لحاظ سے عیسائی اور یہودی کے الفاظ اپنے اصل اطلاق کے علاوہ دیگر ضمنی (مثلا نفرت و حقارت کے) معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ پاکستان میں عیسائی خاص طور پر اپنے صفائی کے عمومی پیشے کے اعتبار سے کم تر، اور بعض اپنی مخصوص زیرِ زمین سرگرمیوں (جیسے اپنے حاصل کردہ لائسنس کی وجہ سے مسلمانوں کو شراب کی سپلائی، وغیرہ) کے لحاظ سے بدنام خیال کیے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر شودر جاتی کے ہندوؤں سے عیسائی ہوئے تھے، اور زیادہ تر ان کا پیشہ بھی وہی رہا جو پہلے تھا۔ عام طور پر غربت کے باعث ان میں سے کئی لوگ غیر قانونی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہوتے ہیں۔ ورنہ آنجہانی جسٹس کارنیلیس سمیت کئی عیسائی تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ شخصیت کے مالک اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں، نیز پارلیمنٹ میں بھی ان کی نمائندگی ہے۔

(ضمناً) یہودی کمیونٹی عالمی سطح پر اپنی مخصوص نسلی خصوصیات کے باعث 'غیر' کے طور پر مشہور رہی ہے۔ 'کتابِ مقدس' میں قدیم اور جدید عہد نامے اکٹھے کر دیے جانے کے باوجود عیسائیوں اور یہودیوں کی مغائرت بھی زیادہ تر ہم آہنگی میں نہیں بدل سکی، اور کم سے کم داخلی لحاظ سے وہ آپس میں 'غیر' ہی رہے ہیں۔ نازیوں کے مظالم (ہولوکوسٹ) کے باعث..... (جو 1985ء میں فرانس کی نانتے یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیے گئے ایک تھیسس، جس کے ریسرچر ہنری راک کو دھمکیاں دی گئیں اور مختلف ذرائع سے تنگ کیا گیا، نیز تھیسس پر دی گئی ڈگری بعد میں عالمی صہیونی دباؤ کے تحت واپس لے لی گئی اور اس تھیسس کو ضبط کر لیا گیا تھا، اس ریسرچ کے مطابق 'گیس چیمبرز' کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر باہم متناقض و متضاد ہیں کہ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا)...... بہر کیف، یہودیوں پر مظالم کے قصوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے صہیونی تحریک کو پروان چڑھنے اور یہودیوں کو دنیا کی نظر میں ہمدردی، نیز دوسری عالمی جنگ کی آڑ میں فلسطینی علاقوں میں ایک ملک حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ اسرائیل کی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ پاکستان کے ایک سابق وزیرِ اعظم ملک فیروز خان نون (جو تقسیمِ ہند سے قبل لندن میں ہائی کمشنر تھے) نے انگریز کی طرف سے سونپی گئی ایک اسائنمنٹ کے طور پر تشکیل دیا تھا، اور مجموعی لحاظ سے جس پر عمل کرتے ہوئے اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ (تفصیل کے لیے لندن سے نکلنے والے Impact International کا اگست 2003ء کا شمارہ دیکھیے)۔ اس طرح 'دوسرے' کی زمین غصب کر کے اسرائیل کے قیام پر مسلمانوں کے ہاں غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ انگریزی میں قرآن کے مترجم عبد اللہ یوسف علی (جو برطانیا میں مقیم تھے) نے تقریر و تحریر کے ساتھ ساتھ شعر کی صورت میں بھی آنسو بہائے، اور مصر کے دائیں بازو کے ایک ادیب علی احمد باکثیر نے شیکسپیئر کے 'مرچنٹ آف وینس' سے 'شائیلوک' کا یہودی کردار مستعار لے کر (جدید شائیلوک) کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی تحریر کیا...... (ضمناً: شیکسپیئر کے ڈرامے میں 'شائیلوک' ایک قابلِ نفرین کردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی صہیونی دباؤ کے باعث بعض یورپی ممالک میں اس ڈرامے کے اسٹیج کرنے پر پابندی رہی)...... ایک بڑی جنگ، جس کی آڑ میں میں عراق کا ایٹمی ری ایکٹر بھی تباہ کیا گیا، اور آج تک کی مسلسل جھڑپوں کے باعث عربوں کے ہاں یہودی کا لفظ نفرت سے بڑھ کر گالی کے طور پر

استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مقابل یہودی اپنے نظریاتی مخالف کو 'سامی نسل کا دشمن' (Anti-semitic) قرار دے کر ایک طرح سے 'ہٹ لسٹ' میں درج کر لیتے ہیں۔ حال آں کہ عرب بھی سام بن نوح ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۰۸۔ فرہنگِ آصفیہ، از مولوی سید احمد دہلوی، (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، 1977ء)، جلد 1، صفحہ 603۔

۱۰۹۔ حاشیہ از مترجم: اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے (جیسے کہ مضمون کے اگلے پیراگراف سے بھی کسی حد تک واضح ہوتا ہے) کہ مغرب میں بیش تر نو مسلم خواتین و حضرات، جن کا عربوں سے رابطہ ہے یا رہا ہے، وہی عام طور پر ناموں کا عربی تلفظ ادا کرتے ہیں۔ تاہم، یہ بھی واضح ہے کہ بہت سی مسلمان قومیں اپنے علاقائی لہجے کے اعتبار سے خالص عربی حروف کے مخارج عام طور پر ادا نہیں کر سکتیں، اور نہ ان پر یہ واجب ہے۔ اسی طرح مضمون کی ابتدا میں ایک صاحبِ علم کی یہ رائے بھی سامنے آ چکی ہے کہ عربی نام رکھنا کوئی لازمی امر نہیں۔ اردو میں نطق اور تلفظ کے حوالے سے یہ سب جانتے ہیں کہ صرف (ق) کا عربی والا حلقی مخرج الفاظ کے بولنے میں ادا کیا جاتا ہے، اور وہ بھی اردو اہلِ زبان کے ایسا کرنے کی وجہ سے۔ ورنہ اردو بولتے وقت بہت سے لوگ (خاص طور پر پنجاب کے علاقوں میں) یہ مخرج ادا نہیں کرتے یا کر سکتے۔ (علامہ اقبال قینچی کو کینچی بولتے تھے۔ جس پر رشید احمد صدیقی کو دھچکا لگا کہ اردو کا یہ تیسرا عظیم شاعر قاف کا مخرج نہیں نکال سکتا!)۔ (ق) کے علاوہ ح، ع، ط، ظ، ذ، ص، ض اور و (جو انگریزی W کی طرح صرف ہونٹوں سے ادا ہوتا ہے) کا عربی مخرج اگر الفاظ کی ادائیگی میں اردو بولتے وقت نکالا جائے تو خاصی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گی (جیسے خاص طور پر ح، ع اور ص کے حروف والے الفاظ ادا کرتے ہوئے ہمارے ہاں بعض مولوی صاحبان، نیز کچھ دیگر حضرات اردو اور مقامی زبانیں بولتے وقت کیا کرتے ہیں)۔ عربی میں تکلم کیا جائے تو ان مخارج کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ ابلاغ ممکن نہ ہو گا۔ جب کہ دوسری زبان میں کسی علمی ضرورت کے تحت ہی اصل عربی تلفظ ادا کیا جاتا ہے۔ بعینہٖ ان انگریزی الفاظ کے مانند جو اردو میں رواج پا چکے ہیں، مگر اردو بولتے وقت ان کا انگریزی تلفظ ادا نہیں کیا جاتا۔

....